۲۰

طٰہٰ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود

اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، مخالفین کے مقابل میں، صبر اور انتظار کی تلقین ہے کہ آپ ان کے پیچھے زیادہ پریشان نہ ہوں، اگر یہ آپ کی بات نہیں سنتے تو بہت جلد یہ اپنا انجام خود دیکھ لیں گے۔ اسی مضمون سے سورہ کا آغاز بھی ہوا ہے اور اسی پر اختتام بھی۔ اس صبر کے حصول اور اس کی تربیت کے لیے نماز اور دعا کے اہتمام کی ہدایت فرمائی گئی ہے اور ساتھ ہی عجلت و بے صبری کے نقصانات واضح فرمائے گئے ہیں۔ سورہ میں خطاب تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مخالفین سے اگر کوئی بات کہی بھی گئی ہے تو ان کو خطاب کر کے نہیں بلکہ منہ پھیر کر غائبانہ انداز میں کہی گئی ہے۔

پچھلی سورہ میں متعدد انبیائے عظام کا ذکر آیا ہے۔ اس میں صرف حضرت موسیٰ کی سرگزشت تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ ولادت سے لے کر دعوت و ہجرت تک جتنے اہم موڑ بھی ان کی زندگی میں پیش آئے ہیں سب اس سورہ میں نمایاں کیے گئے ہیں تاکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، دعوت کے اس مرحلہ میں بھی اور آگے کے مراحل میں بھی، جس رہنمائی کی ضرورت ہے وہ ایک عملی مثال کی صورت میں آپ کے سامنے رکھ دی جائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

مطالب کے اعتبار سے یہ سورہ تین حصوں میں تقسیم ہے۔

(۱-۸) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت دل نواز انداز میں یہ ہدایت کہ آپ دوسروں کے ایمان کی فکر میں اپنی زندگی کو ضرورت سے زیادہ نہ کھپائیں۔ آپ کا کام صرف ان لوگوں کو یاد دہانی کر دینا ہے جن کے اندر کچھ خشیت ہے۔ جن کے دل خشیت سے خالی ہیں ان کے اندر ایمان اتار دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ قرآن کسی سائل کی درخواست نہیں ہے بلکہ خالق ارض و سماء اور مالک عرش و کونین کا فرمان ہے اس کو اس کے شایان شان انداز میں پیش کیجیے۔ ناقدروں اور مغروروں کی زیادہ ناز برداری کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے رب پر بھروسہ رکھیے۔ وہ آپ کے تمام سرو علانیہ سے اچھی طرح باخبر ہے۔

(۹ - ۹۸) آگے حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جس کے نمایاں پہلو بالاجمال یہ ہیں۔

—— حضرت موسیٰؑ کا مدین سے واپسی پر وادئ مقدس طویٰ میں پہنچنا اور نبوت و رسالت سے سرفراز ہونا۔

—— نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد حضرت موسیٰؑ کو اولین ہدایت۔

—— عصا اور ید بیضا کے معجزات کا عطا کیا جانا۔

—— فرعون کے پاس انذار و دعوت کے لیے جانے کا حکم۔ شرح صدر اور حضرت ہارونؑ کے مددگار بنائے جانے کے لیے حضرت موسیٰؑ کی دعا اور اس دعا کی فوری قبولیت۔

—— حضرت موسیٰؑ کی تقویت قلب کے لیے اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس فضل خاص کی یاد دہانی جو ان پر بچپن میں ہوا کہ وہ دریا میں ڈالے گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ ان کو دریا سے بچا لیا بلکہ ان کے اور اپنے دونوں کے دشمن سے ان کی پرورش کرائی اور دوبارہ ان کو ان کی اس ماں کی آغوش میں پہنچا دیا جس نے فرعون کے ڈر سے، کلیجہ پر پتھر رکھ کر، ان کو دریا کی موجوں کے حوالے کیا تھا۔

—— حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں ایک قبطی کے قتل ہو جانے کے واقعہ کی یاد دہانی۔ حضرت موسیٰؑ کا مدین جانا۔ وہاں مختلف آزمائشوں اور مراحل سے گزرنے کے بعد پھر خدائی پروگرام کے مطابق بالکل معین وقت پر وادئ مقدس طویٰ میں پہنچنا اور منصب نبوت پر سرفراز ہونا۔

—— اس فضل خاص کی یاد دہانی کے بعد حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں کی حوصلہ افزائی اور یہ ہدایت کہ وہ بے خوف و خطر فرعون کے پاس انذار و دعوت کے لیے جائیں۔ خدا ان کی حفاظت فرمائے گا۔

—— فرعون کو حضرت موسیٰؑ کی دعوت اور فرعون کا معارضہ۔

—— فرعون کے جمع کردہ ساحروں اور حضرت موسیٰؑ میں مقابلہ۔ ساحروں کی شکست اور ان کا حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانا۔

—— فرعون کی طرف سے حضرت موسیٰؑ اور ایمان لانے والے ساحروں پر سازش اور بغاوت کا الزام اور ان کو سولی پر چڑھانے کی دھمکی۔

—— بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر حضرت موسیٰؑ کو ہجرت کا حکم۔ فرعون کی طرف سے ان کا تعاقب۔ بالآخر حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کا بخیریت دریا کے پار ہو جانا اور فرعون اور اس کی فوجوں کی غرقابی۔

—— دریا پار کرانے کے بعد بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات فرمائے ان کا حوالہ اور بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی چند روزہ غیبت میں، جب کہ وہ کوہ طور پر تورات لینے گئے، سامری کے فتنہ میں مبتلا ہو کر جو حرکت کی اس کی تفصیل اور اس کے اسباب و عواقب پر تبصرہ۔

(۹۹ - ۱۳۵) حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت سنانے کے بعد یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب اور التفات ہے۔ اور سورہ کی تمہید میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس خاتمہ میں اس کی تکمیل کر دی گئی ہے۔ آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ ماضی

کی یہ سرگزشت جو آپ کو سنائی گئی ہے صرف قصۂ ماضی نہیں ہے بلکہ آپ کی اپنی سرگزشت بھی ہے۔ آپ کو جو کتاب عطا ہوئی ہے اس میں ہر پہلو سے لوگوں کو تنبیہ کر دی گئی ہے۔ اگر لوگ نہیں مانیں گے تو اس کا انجام دنیا اور آخرت دونوں میں خود بھگتیں گے۔ تاریخ میں ان کے لیے کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ اس وجہ سے آپ ان کے معاملے میں جلدی نہ کریں۔ صبر کے ساتھ خدا کے فیصلہ کا انتظار کریں۔ جلدی شیطان کو دراندازی کے لیے راہ دے دیتی ہے۔ آدمؑ نے جلدی ہی کی وجہ سے شیطان سے دھوکا کھایا تو آپ صبر کے ساتھ خدا کے وعدۂ نصرت کے ظہور کا انتظار کریں اور اس صبر کے حصول کے لیے نماز کا اہتمام کریں۔ امراء و اغنیاء کے ایمان کے لیے بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ ان کے ایمان سے دعوت کو قوت و شوکت حاصل ہوگی۔ آپ کی دعوت اپنا زادِ راحلہ خود اپنے ساتھ رکھتی ہے اور اللہ نے آپ کی کفالت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے۔ جو لوگ آپ کو زچ کرنے کے لیے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان سے کہہ دیجیے کہ میرا کام آگاہ کرنا تھا وہ میں نے کر دیا۔ اب اگر تم عذاب ہی کے منتظر ہو تو انتظار کرو۔ میں بھی اسی کا منتظر ہوں۔

سُوْرَةُ طٰهٰ (۲۰)

مَكِّيَّةٌ ———————— اٰيَاتُهَا ۱۳۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۸

طٰهٰ ﴿۱﴾ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ﴿۲﴾ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۳﴾ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ﴿۴﴾ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴿۵﴾ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ﴿۶﴾ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ﴿۷﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴿۸﴾

ترجمۂ آیات ۱ — ۸

یہ سورۂ طٰہٰ ہے۔ ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ تم مصیبت میں پھنس جاؤ۔ یہ تو بس ان لوگوں کے لیے یاددہانی ہے جو خدا سے ڈریں۔ یہ نہایت اہتمام کے ساتھ اس ذات کی طرف سے اتارا گیا ہے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔ جو رحمان عرش حکومت پر متمکن ہے۔ اسی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، جو کچھ زمین میں ہے، جو کچھ ان کے درمیان ہے

اور جو کچھ زمین کے نیچے ہے۔ ۱-۶

خواہ تم علانیہ بات کہو یا چپکے سے، وہ علانیہ اور پوشیدہ سب کو جانتا ہے۔ اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تمام اچھی صفتیں اسی کے لیے ہیں۔ ۷-۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

طٰہٰ (۱)

یہ حروف مقطعات میں سے ہے۔ ان حروف پر مفصل بحث سورہ بقرہ کے شروع میں دیکھیے۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى (۲)

تبلیغ میں حضورؐ کی محنت شاقہ اور آپ کو دل نواز تسلی

یہ نہایت دل نواز اور پُرمحبت انداز میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھایا ہے کہ قرآن کی تبلیغ و دعوت سے متعلق آپ نے اپنے سر پر جو ذمہ داری اٹھائی ہے اور جو محنت شاقہ اس کے لیے آپ جھیل رہے ہیں، اس کا مطالبہ ہرگز آپ سے نہیں ہے۔ آپ کی ذمہ داری صرف لوگوں تک اس کتاب کو پہنچا دینے کی ہے۔ جن کے اندر حق شناسی کی صلاحیت اور خشیت الٰہی کی کچھ رمق ہوگی وہ اس کو قبول کریں گے، جو ان صلاحیتوں سے عاری ہیں ان کے دلوں میں اس کو اتار دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ ان کے پیچھے آپ اپنی زندگی کو اجیرن بنا لیں۔

یہ بات ہم اس کتاب میں متعدد جگہ واضح کر چکے ہیں کہ رات دن دعوت کے کام میں لگے رہنے کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیکھتے کہ لوگ اتنی واضح بات کو جھٹلا رہے ہیں اور کسی طرح ان کے دل نرم ہوتے نظر نہیں آتے تو آپ کو یہ پریشانی ہوتی کہ مبادا اس میں آپ ہی کی کسی کوتاہی کو دخل ہو۔ اس احساس سے دعوت کے کام میں آپ کی سرگرمیاں اور بڑھ جاتیں اور سارے جتن کر ڈالنے کے باوجود آپ کو کسی طرح تشفی نہ ہوتی۔ آپ کی اسی حالت پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ قرآن آپؐ پر اس لیے نہیں اتارا گیا کہ آپؐ کی زندگی اجیرن ہو کے رہ جائے۔ آپ کی جو ذمہ داری ہے وہ ادا کر دیجیے۔ دوسروں کے ایمان و اسلام کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (۳)

قرآن ایک تذکرہ ہے

اس ٹکڑے سے قرآن کی حیثیت بھی واضح ہو گئی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کی حد بھی معین ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کون لوگ اس سے اثر پذیر ہوں گے اور کون اس سے محروم رہیں گے۔

فرمایا کہ یہ تو بس ایک 'تذکرہ' ہے۔ 'تذکرہ' کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یاد دہانی جس چیز کی کی جاتی ہے وہ خارج سے لائی ہوئی چیز کی نہیں کی جاتی بلکہ اس چیز کی کی جاتی ہے جو مخاطب کے خود اپنے پاس ہو لیکن وہ اس کو بھولا ہوا ہو۔ قرآن پر غور کیجیے تو اس کی اصلی نوعیت یہی ہے۔ وہ کوئی اوپری اور انوکھی چیز نہیں ہے۔ وہ کسی خارج سے لائی ہوئی چیز کو ہمارے اوپر نہیں لادتا بلکہ انہی حقائق کی یاد دہانی کرتا ہے جو خود ہماری فطرت کے اندر موجود ہیں لیکن ہم ان سے غافل ہیں۔ قرآن ان حقائق کی یاد دہانی کے لیے جو دلائل استعمال کرتا ہے وہ بھی آفاق و انفس کے وہی دلائل ہیں جو ہماری عقل کے خزانے میں موجود ہیں۔ لیکن ہم یا تو ان کو استعمال نہیں کرتے یا ان کے بدیہی نتائج کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ عبرت و موعظت کے لیے قرآن نے جو تاریخ پیش کی ہے وہ بھی ان قوموں کی پیش کی ہے جو مخاطب گروہ کی جانی پہچانی ہوئی تھیں۔ جن انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا حوالہ دیا ہے یہ بھی وہ انبیاء ہیں جن کی ذریت اور جن کے پیرو ہونے کے لوگ مدعی تھے۔

قرآن سے اثر پذیر ہونے کے لیے شرط

اس یاد دہانی سے اثر پذیر ہونے والوں کی صفت "لِّمَنْ يَّخْشٰى" بیان فرمائی۔ قرینہ دلیل ہے کہ 'يَخْشٰى' کا مفعول یہاں محذوف ہے۔ قرآن کے نظائر کی روشنی میں اس محذوف کو متعین کیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ 'لِمَنْ يَخْشٰى رَبَّهٗ بِالْغَيْبِ' یعنی یاد دہانی ان لوگوں کے لیے ہے جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ یہ دوسرے لفظوں میں وہی بات ارشاد ہوئی ہے جو بقرہ کی دوسری ہی آیت میں 'هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ وہاں ہم نے تفصیل سے واضح کیا ہے کہ یہ تقویٰ اور یہ خوف ان تمام لوگوں کے اندر موجود ہوتا ہے جن کی فطرت مسخ ہونے سے محفوظ ہوتی ہے۔ اس طرح کے لوگوں پر اگر غفلت ہوتی ہے تو وہ قرآن کی یاد دہانی سے دیر سویر جاگ پڑتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنی بداعمالیوں سے اپنی فطرت مسخ کر لیتے ہیں ان کو کتنا ہی جھنجھوڑیے وہ کروٹ نہیں لیتے۔ ان کے اوپر گدھوں کی طرح ڈنڈے کی منطق کے سوا اور کوئی منطق کارگر نہیں ہوتی۔ وہ سب کچھ سر کی آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں لیکن خدا کے ہاں ماننا صرف وہ معتبر ہے جو عقل و دل کی آنکھوں سے دیکھ کر مانا جائے نہ کہ سر کی آنکھوں سے۔

نبی مذکّر ہوتا ہے نہ کہ مصیطر

قرآن کے تذکرہ ہونے سے یہ بات بھی نکلی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک 'مذکّر' کی ہے، نہ کہ ایک 'مصیطر' کی۔ آپ کا فریضہ صرف یہ تھا کہ آپ لوگوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیں۔ لوگ اس سبق کو یاد کرتے ہیں یا نہیں، یہ لوگوں کی ذمہ داری تھی نہ کہ آپ کی۔ قرآن نے یہاں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اگر آپ کی قوم کے لوگ آپ کی تذکیر سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں تو آپ پریشان نہ ہوں، اس کے لیے جواب دہ عنداللہ وہ ہیں نہ کہ آپ۔

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى (۴)

'تنزیل' کا مفہوم

'تَنْزِیْلًا' کے معنی دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ کسی چیز کو نہایت اہتمام اور ترتیب و تدریج کے ساتھ اتارنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن چونکہ لوگوں کی یاد دہانی کے لیے اُترا ہے اس وجہ سے اللہ نے صرف اتنے پر اکتفا نہیں فرمایا کہ کسی نہ کسی طرح بات ایک مرتبہ لوگوں تک پہنچ جائے بلکہ نہایت اہتمام اور تدریج اور وقفہ وقفہ کے ساتھ اس کو اتارا تاکہ لوگوں کے لیے یہ عذر باقی نہ رہے کہ بات کے سنانے یا سمجھانے میں کوئی کسر رہ گئی۔

قرآن کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ خالق کا فرمان ہے

'مِمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی'۔ یہ قرآن کی عظمت واضح فرمائی کہ یہ زمین اور بلند آسمانوں کے خالق و مالک کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ نہ یہ کوئی ہوائی بات ہے کہ یوں ہی ہواؤں میں اڑ جائے نہ یہ کسی سائل کی درخواست ہے کہ لوگوں نے قبول کرلی تو سائل پران کا کرم ہوگا، نہ قبول کی تو سائل محروم ہو کر رہ جائے گا۔ بلکہ یہ خالق ارض و سما کا فرمان واجب الاذعان ہے اگر لوگوں نے اس کو رد کیا تو اچھی طرح سوچ لیں کہ اس کے نتائج کیا کچھ ہو سکتے ہیں۔

اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ اشارہ بھی ہے کہ اس کو اسی طرح لوگوں کے سامنے پیش کیجیے جس طرح آسمان و زمین کے خالق و مالک کا کلام پیش کیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے نہ زیادہ استمالت کی ضرورت ہے، نہ کسی الحاح و اصرار کی۔ اس کے قبول کرنے میں لوگوں کا اپنا نفع ہے نہ کہ خدا کا۔ یہ کوئی ملتجیانہ درخواست نہیں ہے بلکہ خلق کے لیے صحیفۂ ہدایت ہے اس کو رد کرنے والے خود اپنی شامت بلائیں گے۔ آپ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔

یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ سورۂ عبس میں یہی حقیقت یوں واضح کی گئی ہے۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ	ہرگز نہیں! یہ تو ایک یاد دہانی ہے تو جو چاہے
ذَكَرَهٗ ۝ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ	اس سے فائدہ اٹھائے۔ یہ معزز، بلند اور پاکیزہ
مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍۭ	صحیفوں میں ہے۔ باعزت اور باوفا کاتبوں کے
بَرَرَةٍ ۔ (۱۱-۱۶)	ہاتھ میں۔

(۵-۶)
اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى

قرآن کی عظمت کا بیان اور یہ خدا کی جن صفات کا مظہر ہے ان کا حوالہ

یہ قرآن کی عظمت کا بیان بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی جن صفات کا یہ مظہر ہے ان کی طرف اشارہ بھی۔ فرمایا کہ وہ خالق ارض و سما رحمان ہے۔ اس کی رحمانیت کا تقاضا ہے کہ وہ خلق کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ نہ دے بلکہ جس طرح اس نے اس کی مادی زندگی کے اسباب و وسائل مہیا فرمائے اسی طرح اس کی ہدایت کا سامان بھی کرے، چنانچہ اس نے انسان کی رہنمائی کے لیے اس کو عقل و نطق سے نوازا اور اس پر مزید فضل یہ فرمایا کہ اس کی ہدایت کے لیے اپنی کتاب اتاری۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ رحمٰن میں اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ آج جو لوگ قرآن کو رد کر رہے ہیں وہ نہ تو خدا کا کچھ بگاڑ رہے ہیں نہ اس کے رسول کا بلکہ خود اپنے آپ کو خدا کی سب سے بڑی رحمت سے محروم کر رہے ہیں۔

'عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى' یہ خدائے رحمان کی صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ دنیا کو پیدا کر کے الگ تھلگ کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے بلکہ بالفعل اپنی کائنات کے عرش حکومت پر متمکن ہے۔ اس کائنات کا حقیقی فرمانروا وہی ہے اس وجہ سے لوگوں کو قرآن کے ذریعہ سے اس نے اپنے احکام و قوانین سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس آگاہی کے بعد جو لوگ اپنی من مانی کریں گے وہ حساب کے دن اپنا انجام خود دیکھ لیں گے۔

'لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى' یہ شرک کے ہر جرثومہ کی جڑ کاٹ دی۔ فرمایا کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان اور جو کچھ زیر زمین ہے سب کا خالق و مالک وہی ہے۔ سب کو خلق بھی اسی نے کیا ہے اور سب پر اختیار بھی اسی کا ہے۔ اس کائنات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اس کی خدائی سے باہر ہو جس کو کسی خاص دائرے میں کوئی آزادی ملی بھی ہے وہ بھی اس کے امر و حکم کے تحت ہے۔ اس وجہ سے کوئی یہ گمان نہ کرے کہ وہ خدا سے کہیں بھاگ سکتا ہے یا کوئی دوسرا اس کو پناہ دے سکتا ہے۔

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى (۷)

عربیت کا ایک اسلوب

فصیح عربی کے اسلوب کے مطابق اس میں متقابل کے الفاظ بربنائے قرینہ، حذف ہیں۔ اس اسلوب کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آئے ہیں۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات گویا یوں ہوگی، 'وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ اَوْ تُخَافِتْ بِهٖ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَالسِّرَّ وَاَخْفٰى' یعنی خواہ تم بات کو علانیہ کہو یا چپکے سے کہو، خدا علانیہ، پوشیدہ اور پوشیدہ تر سب کو جانتا ہے۔

نبی صلعم کو ایک نئے پہلو سے تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دوسرے پہلو سے تسلی دی گئی ہے کہ آپ مطمئن رہیں کہ اپنی مشکلات میں جو کچھ بھی آپ اپنے پروردگار سے کہتے اور جو دعا و مناجات بھی کرتے ہیں خواہ سرًّا یا علانیۃً، اور جو پریشانی بھی آپ کو لاحق ہوتی ہے خواہ وہ زبان پر آئے یا دل کے مخفی گوشوں ہی میں رہے، آپ کا رب علیم و خبیر ہر چیز سے باخبر رہتا ہے۔ مقصود اس حقیقت کے اظہار سے ظاہر ہے کہ اس کا لازم ہے۔ یعنی جب آپ کا پروردگار ہر مخفی سے مخفی بھید سے بھی واقف ہے تو وہ آپ کی ہر مشکل کو آسان کرے گا اور ہر موڑ پر آپ کی رہنمائی فرمائے گا۔ اگر کسی امر میں کوئی تاخیر ہوتی ہے تو وہ کسی حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اسی میں آپ کے لیے خیر و برکت ہے۔ سورہ مریم کی آیت ۶۴ 'وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں مزید تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (۸)

تفویض کی ہدایت

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کامل تفویض کی ہدایت ہے کہ آپ مخالفین کے رویہ سے پریشان اور ان کے پیچھے ہلکان ہونے کے بجائے اپنا معاملہ کلیۃً اپنے رب کے حوالے کیجیے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے ہوتے آپ کسی کے محتاج نہیں۔

تسلی و طمانیت کا خزانہ

لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔ یہ ٹکڑا تسلی و طمانیت کا خزانہ ہے۔ اوپر کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو

اسمائے حسنیٰ کی برکات

جو تسلی دی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے اس کی عظمت، اس کی رحمت، اس کی حاکمیت، اس کی یکتائی اور اس کے علم کے مقتضیات کی روشنی میں دی گئی ہے لیکن خدا کی صفات اتنی ہی تو نہیں ہیں! وہ تو تمام اچھی اور اعلیٰ صفتوں سے متصف ہے تو ظاہر ہے کہ ان صفات کے مقتضیات بھی حضورؐ کے لیے حالات کے اعتبار سے ظاہر ہوں گے۔ گویا اس ٹکڑے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ تمام اچھی صفتیں خدا ہی کے لیے ہیں اور وہ سب آپ کے اوپر سایہ فگن ہیں، آپ ان میں سے جس کا سہارا بھی لیں گے اس کی برکتوں سے متمتع ہوں گے۔ ان کے سوا آپ کسی اور سہارے کے محتاج نہیں ہیں۔

اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ یہاں اسماء سے مراد صفاتِ الٰہی ہیں اس لیے کہ خدا کے تمام نام اس کی صفات ہی کی تعبیر ہیں۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹ تا ۹۸

اوپر کے مجموعۂ آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تسکین و تسلی دی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی روشنی میں دی گئی ہے۔ اب آگے حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت آ رہی ہے جس میں وہی حقیقتیں، جو اوپر علمی انداز میں بیان ہوئی ہیں، چلتی پھرتی عملی زندگی میں دکھا دی گئی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد جن آزمائشوں سے گزرنا پڑا اور ان میں اللہ کی مدد نے جس طرح ان کو سہارا دیا، ان کی تفصیل اس سرگزشت میں آ گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے جو مراحل آنے والے تھے ابھی ان کا بہت بڑا حصہ پس پردہ تھا اس سرگزشت نے ان مراحل کو بھی آپؐ کے سامنے کر دیا اور ان کے لیے جن تیاریوں کی ضرورت تھی ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ زندگی عملی مثالوں سے جس قدر متاثر ہوتی ہے دوسری کسی چیز سے اس قدر متاثر نہیں ہوتی۔ خاص طور پر ایک نبی کی سرگزشت دوسرے نبی کے لیے تو سمجھیے کہ بس اس کی اپنی ہی آپ بیتی ہوتی ہے۔

ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۹-۹۸

وَهَلْ أَتٰىكَ حَدِيثُ مُوسٰى ﴿٩﴾ إِذْ رَأٰى نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوٓا إِنِّيٓ آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيٓ آتِيكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴿١٠﴾ فَلَمَّآ أَتٰىهَا نُودِيَ يٰمُوسٰى ﴿١١﴾ إِنِّيٓ أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿١٢﴾ وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى ﴿١٣﴾ إِنَّنِيٓ أَنَا اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ

لِذِكْرِيْ ﴿١٤﴾ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا
تَسْعٰى ﴿١٥﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ
فَتَرْدٰى ﴿١٦﴾ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿١٧﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا
عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿١٨﴾ قَالَ اَلْقِهَا
يٰمُوْسٰى ﴿١٩﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿٢٠﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ
سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿٢١﴾ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ
بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿٢٢﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿٢٣﴾
اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَ ع
يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَ
اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾ وَ
اَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾
اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿٣٦﴾ وَ
لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿٣٧﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿٣٨﴾
اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ
يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ۭ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ
عَلٰى عَيْنِيْ ﴿٣٩﴾ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ وقف لازم
فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۥ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ
مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۣ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۥ ثُمَّ جِئْتَ

عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی ﴿۴۰﴾ وَاصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ ﴿۴۱﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْکَ
بِاٰیٰتِیْ وَلَا تَنِیَا فِیْ ذِکْرِیْ ﴿۴۲﴾ اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۴۳﴾
فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی ﴿۴۴﴾ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا
نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ﴿۴۵﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ
اَسْمَعُ وَاَرٰی ﴿۴۶﴾ فَاْتِیٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّکَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا
بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰکَ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکَ ؕ وَالسَّلٰمُ
عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ کَذَّبَ
وَتَوَلّٰی ﴿۴۸﴾ قَالَ فَمَنْ رَّبُّکُمَا یٰمُوْسٰی ﴿۴۹﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ
خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ﴿۵۰﴾ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ﴿۵۱﴾ قَالَ عِلْمُهَا
عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ کِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی ﴿۵۲﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ
الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَکَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ
فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴿۵۳﴾ کُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَکُمْ ؕ
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ﴿۵۴﴾ مِنْهَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُکُمْ
وَمِنْهَا نُخْرِجُکُمْ تَارَةً اُخْرٰی ﴿۵۵﴾ وَلَقَدْ اَرَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا کُلَّهَا فَکَذَّبَ
وَاَبٰی ﴿۵۶﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِکَ یٰمُوْسٰی ﴿۵۷﴾
فَلَنَاْتِیَنَّکَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَیْنَنَا وَبَیْنَکَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ
نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَکَانًا سُوًی ﴿۵۸﴾ قَالَ مَوْعِدُکُمْ یَوْمُ الزِّیْنَةِ وَاَنْ
یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًی ﴿۵۹﴾ فَتَوَلّٰی فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ کَیْدَهٗ ثُمَّ اَتٰی ﴿۶۰﴾ قَالَ

لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ
وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾
قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ
بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ
ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ
تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿٦٥﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ
وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ
نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿٦٧﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿٦٨﴾ وَ
اَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا
يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿٦٩﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا
بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿٧٠﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ
لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ
مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ
عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿٧١﴾ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ
فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٧٢﴾
اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ
وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿٧٣﴾ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ
لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿٧٤﴾ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ

فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾ وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ

ع ۲ ۲۲ ۱۲

اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِىْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ
لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ
مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾
يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ
الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿۸۰﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِىْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ
عَلَيْهِ غَضَبِىْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۱﴾ وَاِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ
صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾ وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ
هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا
قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى
اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا
حَسَنًا ؕ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِىْ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ
بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ
اَلْقَى السَّامِرِىُّ ﴿۸۷﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا
هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۚ فَنَسِىَ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ

قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۠ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰـهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

ع ۱۴ ۱۲

ترجمہ آیات ۹ - ۹۸

اور کیا موسیٰ کی سرگزشت تمہارے علم میں آئی ہے جب کہ اس نے دیکھا ایک شعلہ تو اس نے اپنے اہلِ خانہ سے کہا کہ تم لوگ ذرا ٹھہرو، مجھے آگ نظر آئی ہے تاکہ میں اس میں سے ایک انگارہ لاؤں یا ممکن ہے مجھے وہاں راستہ کا کچھ سراغ مل جائے۔ ۹

تو جب وہ اس کے پاس آیا تو اس کو آواز آئی کہ اے موسیٰ یہ تو میں تمہارا رب ہوں تو تم اپنے جوتے اتار دو کیونکہ تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ اور میں نے تم کو برگزیدہ کیا تو جو وحی کی جا رہی ہے اسے غور سے سنو! بیشک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کیجیو اور میری یاد

کے لیے نماز کا اہتمام رکھیو۔ بے شک قیامت شدنی ہے۔ میں اس کو چھپائے ہی رکھوں گا تاکہ ہر جان کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے۔ تو نماز سے تمھیں وہ شخص غافل نہ کرنے پائے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں کا پیرو ہے کہ تم ہلاک ہو کر رہ جاؤ۔ ۱۰-۱۶

اور یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے، اے موسیٰؑ! اس نے کہا، یہ میری لٹھیا ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لیے دوسرے فائدے بھی ہیں۔ فرمایا، اس کو زمین پر ڈال دو، اے موسیٰؑ! اس نے اس کو ڈال دیا تو دفعتہً وہ ایک رینگتا ہوا سانپ بن گئی۔ فرمایا اس کو اٹھا لو اور ڈرو نہیں، ہم اس کو پھر اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔ اور اپنے ہاتھ کو اپنے بازو کی طرف سکیڑ لو، وہ وہاں سے ایک دوسری نشانی بن کر، چٹا سفید، بغیر کسی مرض کے، برآمد ہوگا تاکہ ہم اپنی بڑی نشانیوں میں سے بعض کا تمھیں مشاہدہ کرائیں۔ ۱۷-۲۳

تم فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ اس نے دعا کی کہ اے میرے رب! میرے سینے کو میرے لیے کھول دے، اور میری مہم کو آسان کر اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں اور میرے خاندان سے میرے بھائی ہارونؑ کو، میرے لیے وزیر مقرر کر کے میری کمر کو مضبوط کر اور اس کو میری ذمہ داری میں شریک بنا کہ ہم تیری زیادہ سے زیادہ تسبیح کریں اور زیادہ سے زیادہ تیرا چرچا پھیلائیں۔ بے شک تو برابر ہمارا نگرانِ حال رہا ہے۔ فرمایا، تمھاری درخواست منظور ہوئی، اے موسیٰؑ! ۲۴-۳۶

اور ہم نے تم پر ایک بار اور بھی اپنا فضل کیا جب کہ ہم نے تمھاری ماں کو الہام کی وہ بات جو وحی کی جا رہی ہے، کہ اس کو صندوق میں رکھ دو پھر اس کو دریا میں ڈال دو۔ پس یوں ہو کہ دریا اس کو کنارے پر ڈال دے کہ اس کو اٹھا لے وہ جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے اور میں نے

تم پر اپنی محبت کا پرتو ڈال دیا اور تاکہ تمھاری پرورش میری نگرانی میں ہو۔ جب کہ تمھاری بہن جاتی اور کہتی تھی کہ کیا میں ایسے لوگوں کا پتہ دوں جو اس بچے کی پرورش کریں۔ پس ہم نے تم کو تمھاری ماں کی طرف لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کھائے۔ ۳۷-۴۰

اور تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تو ہم نے تم کو غم سے نجات دی اور ہم نے تم کو خوب خوب پرکھا۔ پھر تم کئی سال اہل مدین میں رہے۔ پھر ایک خاص اندازہ کیے ہوئے وقت پر تم یہاں پہنچے اے موسیٰ! اور میں نے اپنے کارِ خاص کے لیے تمھیں منتخب کیا۔ ۴۰-۴۱

تم اور تمھارا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ جاؤ اور میرے ذکر میں ڈھیلے نہ پڑنا۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بے شک وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ پس اس کو نرمی کے ساتھ دعوت دو، شاید وہ یاد دہانی حاصل کرے یا ڈرے۔ ۴۲-۴۴

انھوں نے عرض کی اے ہمارے خداوند، ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر تعدّی کرے یا اس کی سرکشی اور بڑھ جائے۔ فرمایا تم اندیشہ نہ کرو، میں تمھارے ساتھ سب کچھ سنتا دیکھتا ہوں۔ پس اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں، تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان کو عذاب میں مبتلا نہ رکھ، ہم تیرے خداوند کے پاس سے ایک بڑی نشانی بھی لے کر آئے ہیں۔ اور سلامتی ان لوگوں پر ہے جو ہدایت کی پیروی کریں۔ ہم پر یہ وحی کی گئی ہے کہ ان لوگوں پر عذاب ہے جو جھٹلائیں اور اعراض کریں۔ ۴۵-۴۸

اس نے سوال کیا اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ اس نے جواب دیا، ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اس کی رہنمائی کی۔ اس نے پوچھا، تو پھر اگلی قوموں کا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ان کا علم میرے رب کے پاس ایک رجسٹر میں ہے۔ نہ میرا رب بھٹکتا

ہے نہ بھولتا ہے ـــــ وہی جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارا بنایا اور اس میں تمہارے لیے راہیں نکالیں اور آسمان سے پانی برسایا، پس ہم نے اس سے مختلف نباتات کی گوناگوں قسمیں پیدا کردیں۔ کھاؤ اور اپنے چوپایوں کو چراؤ۔ اس کے اندر اہل عقل کے لیے نشانیاں ہیں۔ اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے اور اسی میں تم کو لوٹائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔ ۴۹-۵۵

اور ہم نے اس کو اپنی ساری نشانیاں دکھائیں تو اس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔ اس نے کہا، موسیٰ! کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے بے دخل کردو تو ہم بھی تمہارے مقابل میں ایسا ہی جادو لائیں گے۔ تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک مقام معین ٹھہرالو، کوئی بیچ کی جگہ، نہ ہم اس کی خلاف ورزی کریں نہ تم۔ ۵۶-۵۸

اس نے کہا، تمہارے لیے وعدے کا دن میلہ والا دن ہے اور یہ کہ لوگ بوقت چاشت، جمع کیے جائیں۔ پس فرعون وہاں سے ہٹا اور اپنی ساری تدبیریں اکٹھی کرکے پھر مقابلہ میں آیا۔ موسیٰ نے کہا تمہاری ناس ہو! اللہ پر جھوٹ نہ باندھو کہ وہ تم کو کسی عذاب میں پیس دے اور جس نے خدا پر جھوٹ باندھا وہ نامراد ہوا۔ ۵۹-۶۱

پس انھوں نے آپس میں، اپنے معاملہ میں، مشورت اور سرگوشی کی۔ انھوں نے کہا یہ دونوں بڑے ماہر جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمھیں تمہارے ملک سے بے دخل کردیں اور تمہارے اعلیٰ نظام کو درہم برہم کرکے رکھ دیں۔ تو اپنی ساری تدبیریں اکٹھی کرلو، پھر ان کے مقابل میں متحد ہو کر آؤ اور آج کامیاب وہی رہے گا جو غالب آئے گا۔ ۶۲-۶۴

انھوں نے کہا اے موسیٰ! یا تو تم پیش کرو یا پھر ہم ہی پہلے پیش کرنے والے بنتے ہیں۔ اس نے کہا بلکہ تم ہی پیش کرو۔ تو دفعتًہ ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان کے جادو کے زور سے اس کو اس طرح

نظر آنے لگیں گویا وہ رینگ رہی ہیں تو موسیٰ دل ہی دل میں کچھ ڈرا۔ ہم نے کہا ڈرو نہیں، تم ہی غالب رہو گے اور تم اس کو جو تمہارے ہاتھ میں ہے زمین پر ڈالو یہ ان کے سارے سوانگ کو جو انھوں نے رچایا ہے نگل جائے گا۔ یہ کرتب جو انھوں نے دکھایا ہے یہ تو بس ایک جادوگر کا کرتب ہے اور جادوگر جہاں بھی جائے کامیاب نہیں ہوتا۔ تو جادوگر سجدے میں گر پڑے۔ پکار اٹھے کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لائے۔ ۶۵-۷۰

فرعون نے کہا تم نے بدوں میری اجازت کے اس کی تصدیق کر دی بے شک وہی تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے تو میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا اور تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا اور تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم میں سے کس کی سزا زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہوتی ہے! ۷۱

انھوں نے جواب دیا کہ ہم ان روشن دلائل پر جو ہمارے پاس آئے ہیں اور اس ذات پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، تم کو ہرگز ترجیح دینے والے نہیں ہیں تو تمہیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو۔ تم جو کچھ کر سکتے ہو بس اس دنیاوی زندگی کا کر سکتے ہو! ہم اپنے رب پر ایمان لاتے کہ وہ ہماری خطاؤں کو اور اس جادو کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا، بخشے اور اللہ ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ ۷۲-۷۳

بے شک جو شخص اپنے رب کے سامنے مجرم کی حیثیت سے حاضر ہو گا تو اس کے لیے جہنم ہے، نہ اس میں مرے گا، اور نہ جیے گا۔ اور جو اس کے پاس با ایمان ہو کر جائیں گے، انھوں نے نیک عمل بھی کیے ہوں گے، تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے اونچے درجے ہوں گے۔ ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ صلہ ہے اس کا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ ۷۴-۷۶

اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ میرے بندوں کو شب میں لے کر نکل جاؤ۔ ان کے لیے دریا میں ایک

خشک راہ کھول لو، نہ تمھیں تعاقب سے کوئی خطرہ ہوگا نہ ڈوبنے کا کوئی اندیشہ! تو فرعون نے اپنی فوجوں کے ساتھ ان کا تعاقب کیا، بالآخر ان کو سمندر کی اس چیز نے ڈھانک لیا جس چیز نے ڈھانک لیا! اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا، اس کو صحیح راہ نہ دکھائی! ۷۷ - ۷۹

اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو تمھارے دشمن سے نجات بخشی اور تم سے طور کے مبارک جانب کو ایک میعاد ٹھہرائی اور تم پر ہم نے من وسلویٰ اتارا کہ ہماری بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اس نعمت کو پاکر سرکشی نہ کیجیو کہ تم پر میرا غضب نازل ہو اور جس پر میرا غضب اترا وہ تباہ ہوا! اور میں ان لوگوں کے لیے بڑا ہی غفار ہوں جو توبہ کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح کریں پھر ہدایت کی روش اختیار کریں۔ ۸۰-۸۲

اور اے موسیٰ یہ تم کو، اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی آنے پر کس نے ابھارا؟ اس نے کہا، وہ لوگ بھی میرے پیچھے ہی ہیں، اور میں، اے میرے رب! تیری خوشنودی کے لیے جلدی چلا آیا ہوں۔ فرمایا تو ہم نے تمھاری قوم کو تمھارے پیچھے ایک فتنہ میں ڈال دیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر ڈالا۔ تو موسیٰؑ اپنی قوم کے پاس غصہ اور غم سے بھرا ہوا لوٹا اور بولا کہ اے میری قوم کے لوگو، کیا تم سے تمھارے رب نے نہایت اچھا وعدہ نہیں کیا تھا! کیا تم پر زمانہ زیادہ گزر گیا یا تم نے چاہا کہ تم پر تمھارے رب کا غضب نازل ہو کہ تم نے میری ٹھہرائی ہوئی میعاد کی خلاف ورزی کر ڈالی!! ۸۳ - ۸۶

انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے آپ سے کیے ہوئے عہد کی خلاف ورزی اپنی مرضی سے نہیں کی۔ بلکہ قوم کے زیورات کا بوجھ جو ہمارے حوالہ کیا گیا تھا ہم نے اس کو پھینک دیا اور اس طرح سامری نے ڈھال کر پیش کر دیا۔ ۸۷

پس اس نے ان کے لیے ایک بچھڑا برآمد کر دیا۔ ایک دھڑ جس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی پس انھوں نے کہا یہی تمھارا معبود ہے اور یہی موسیٰؑ کا بھی معبود ہے لیکن وہ بھول گیا ہے۔ کیا

یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے تھے کہ نہ وہ کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ کوئی نقصان یا نفع پہنچا سکتا ہے! ۸۸-۸۹

اور ہارون نے ان سے پہلے ہی کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، تم اس کے ذریعہ سے فتنہ میں ڈال دیے گئے ہو، تمہارا رب خدائے رحمان ہے تو میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔ وہ بولے کہ ہم تو اب اسی کی عبادت پر جمے رہیں گے تا آنکہ موسیٰ ہمارے پاس واپس آجائیں۔ ۹۰-۹۱

موسیٰ نے کہا اے ہارون! جب تم نے دیکھا کہ یہ گمراہ ہوئے جا رہے ہیں تو تم کو میری پیروی سے کس چیز نے روکا! کیا تم نے میرے حکم کی نافرمانی کی۔ اس نے جواب دیا کہ اے میرے ماں جائے! نہ میری ڈاڑھی پکڑیے نہ میرا سر۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ مبادا آپ یہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا لحاظ نہ کیا۔ ۹۲-۹۳

موسیٰ نے پوچھا، اے سامری تیرا کیا ماجرا ہے؟ اس نے جواب دیا مجھے وہ چیز نظر آئی جو اوروں کو نظر نہیں آئی تو میں نے فرستادے کے نقش قدم سے ایک مٹھی اٹھائی اور وہ اس میں ڈال دی اور اس طرح میرے نفس نے مجھے سجھایا۔ موسیٰ نے کہا، چل دور ہو، اب تیرے لیے زندگی بھر یہ ہے کہ تو کہتا پھرے کہ کوئی چھوئے نہیں اور تیرے لیے ایک اور وقت موعود بھی ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں اور اپنے اس معبود کو دیکھ جس پر تو دھرنا دیے رہا ہے، ہم اس کو جلائیں گے، پھر اس کو سمندر میں بکھیر دیں گے۔ تمہارا معبود تو بس اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ ۹۴-۹۸

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اسلوب کے لیے حضرت موسیٰ کی سرگزشت کی خاص اہمیت

وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ (۹)

یہ اسلوب بیان قرآن میں تہدید و وعید کے لیے بھی آیا ہے اور ترغیب و تشویق کے لیے بھی۔ یہاں موقع محل

دلیل ہے کہ یہ ترغیب و تشویق کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے موسیٰؑ کی سرگزشت سنی ہے؟ یہ سرگزشت ہم تمھیں سناتے ہیں۔ اس میں ان تمام سوالوں کا جواب مل جائے گا جو دعوت کے اس مرحلہ میں تمھارے سامنے موجود ہیں، یا آگے کے مراحل میں پیش آنے والے ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت قرآن میں مختلف اسلوبوں سے جو بار بار بیان ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی امت ہی کی وراثت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو منتقل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر صاحب شریعت نبی حضرت موسیٰؑ ہی تھے۔ ان کو اپنی امت کی تشکیل میں جو زہرہ گداز مراحل پیش آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی جس جس طرح نصرت فرمائی وہ ساری باتیں آنحضرتؐ کے لیے نہایت سبق آموز تھیں اور بنی اسرائیل نے قدم قدم پر جو ٹھوکریں کھائیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح و تربیت کے لیے جو ہدایات دیں وہ اس امت کے لیے درس عبرت ہیں۔ اس سرگزشت کو پڑھتے ہوئے اس کی اس اہمیت کو نظر انداز نہ کیجیے۔ یہ دوسروں ہی کی نہیں بلکہ اپنی بھی حکایت ہے۔

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى (۱۰)

حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت ابتدائے نبوت سے

یہ حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کا آغاز اس وقت سے کیا ہے جب ان کو نبوت عطا ہوئی ہے۔ مدین سے واپسی پر جب وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ وادیٔ طور کے پاس پہنچے تو شب کا وقت تھا۔ راستہ کا بھی کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا اور سردی بھی معلوم ہوتا ہے کہ سخت تھی۔ اتنے میں ایک سمت سے انھیں شعلہ سا نظر آیا۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ تم لوگ یہیں ٹھہرو، مجھے ایک شعلہ سا دکھائی دیا ہے، میں وہاں جاتا ہوں یا تو وہاں سے تمھارے تاپنے کے لیے، جیسا کہ سورۂ قصص میں تصریح ہے، کوئی انگارہ لاؤں گا یا وہاں کچھ لوگ ہوئے تو ان سے راستہ معلوم کروں گا اور ہمارا سفر جاری رہ سکے گا۔

ایک شعلۂ مستعجل کا مشاہدہ

'اٰنَسْتُ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کو جو آگ نظر آئی اس کی نوعیت آگ کے کسی جلتے ہوئے الاؤ کی نہیں بلکہ ایک شعلۂ مستعجل کی تھی جو چمکا اور غائب ہو گیا۔ اس لیے یہ لفظ "تاڑنے اور بھانپنے کے لیے آتا ہے۔ بس ایک چمک سی نظر آئی اور دفعتہً غائب ہو گئی۔ حضرت موسیٰؑ کے سوا اس کو کسی نے شاید دیکھا بھی نہیں۔ اگر بھڑکتی ہوئی آگ ہوتی تو حضرت موسیٰؑ یوں کہتے کہ دیکھو وہ سامنے آگ جل رہی ہے، میں یا تو وہاں سے راستہ معلوم کرتا ہوں اور اگر وہاں کوئی نہ ملا تو پھر تاپنے کا کچھ سامان کرتا ہوں تاکہ سردی میں بچاؤ کا کچھ سامان ہو سکے۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۱۱-۱۲)

ندائے غیب

جب حضرت موسیٰؑ اس مقام پر پہنچے جہاں ان کو شعلہ نظر آیا تھا تو ان کو آواز آئی کہ اے موسیٰ یہ تو میں

تمہارا رب ہوں، یعنی تم تو آگ سمجھ کر یہاں آئے ہو لیکن یہاں آگ نہیں ہے بلکہ میں تمہارا رب ہوں۔

تواضع کی ہدایت اور اس کے آداب

'فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ' پہلی ہدایت یہ ہوئی کہ جوتے اتار دو۔ جوتے اتار کر حاضر ہونا صرف طہارت ہی کے آداب میں سے نہیں بلکہ تواضع کے آداب میں سے بھی ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں مسجد کے احترام کے لیے بھی اس کو ضروری قرار دیا گیا ہے اس لیے کہ مسجد خدا کے سامنے حاضری کی جگہ ہے جس کے لیے طہارت اور تواضع دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جوتے صاف ہوں تو ان کے ساتھ مسجد میں جانے میں کوئی ہرج نہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے اس لیے کہ یہ تواضع کے خلاف ہے اور مسجد کی حاضری کے لیے جس طرح طہارت شرط ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ تواضع شرط ہے۔

وادیٔ طویٰ

'اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى' یہ اس ہدایت کی علت واضح فرمائی ہے کہ تم اس وقت طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ 'طُوًى' اس میدان کا نام ہے جو جزیرہ نمائے سینا میں کوہ سینا کے دامن میں واقع ہے۔ کسی پہاڑ یا وادی یا رقبۂ زمین کا تقدس ایک امر اضافی ہے۔ زمین ساری خدا کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اس کے کسی ٹکڑے کو کسی دوسرے ٹکڑے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے الّا آنکہ کسی ٹکڑے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی خاص نسبت ہو جائے۔ اس وادی کو یہ خاص شرف حاصل ہوا کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی تجلّی اور اپنے کلام سے نوازا اس وجہ سے اس کو تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا۔

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (۱۳)

'اِسْتِمَاع' کے معنی توجہ اور اہتمام کے ساتھ سننے کے ہیں۔ یہ جملہ اصل بات کہنے سے پہلے پوری طرح متوجہ کرنے کے لیے ہے یعنی میں نے تمہیں اپنے کارِ خاص، فریضۂ نبوت و رسالت کے لیے منتخب کیا ہے تو جو کچھ تم پر وحی کی جا رہی ہے اس کو غور و توجہ سے سنو۔ اس میں اس تشریف و تکریم کی طرف بھی اشارہ ہے، جو منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے سبب سے حضرت موسیٰؑ کو حاصل ہوئی اور عظیم ذمہ داری کی طرف بھی جو حضرت موسیٰؑ پر اس منصب کی بدولت عاید ہوئی۔

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (۱۴)

حضرت موسیٰؑ کو اولین تعلیم

یہ اولین تعلیم ہے جو حضرت موسیٰؑ کو دی گئی اور یہی تعلیم ہمیشہ تمام انبیاء کو دی گئی ہے۔ اس آیت کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس میں تین باتیں مذکور ہیں۔

سب سے پہلے عقیدۂ توحید اس لیے کہ یہی عقیدہ مرکزِ دین ہے۔ جہاں تک خدا کے ماننے کا تعلق ہے دنیا نے ہمیشہ خدا کو مانا ہے۔ انکارِ خدا کی حماقت موجودہ زمانے کی پیداوار ہے، البتہ شرک کی ضلالت ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں انسان پر حملہ آور ہوتی رہی ہے چنانچہ ہر نبی کو سب سے پہلے توحید ہی کی تعلیم دی گئی اور ہر نبی نے سب سے پہلے شرک ہی کے خلاف جہاد کیا۔

دوسری چیز جس کی حضرت موسیٰؑ کو ہدایت ہوئی وہ خدا کی عبادت ہے۔ یہ عبادت اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

اور یہ حق بلا شرکت غیرے ہے۔ جب وہ معبود ہے تو لازم ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور جب اس کا کوئی شریک نہیں تو یہ بھی لازم ہے کہ یہ عبادت بلا شرکت غیرے ہو۔ اس عبادت کے لوازم میں سے، جیسا کہ ہم دوسرے مقامات میں ذکر کر چکے ہیں، خدا کی اطاعت بھی ہے۔ جس طرح خدا کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں ہے اسی طرح خدا کے احکام کے خلاف، طوعاً کسی کی اطاعت بھی جائز نہیں ہے۔ عبادت کی اصل روح خدا کے آگے اپنی بندگی اور غلامی کا اقرار، اس کے ساتھ اپنے عہد اطاعت، و وفاداری کی تجدید اور اس کا تذکر ہے۔ اس وجہ سے یہ بات خدا کی بندگی کے بالکل منافی ہے کہ تسبیح تو اس کی کی جائے اور شریعت خود تصنیف کی جائے یا کسی دوسرے کے لیے یہ حق تسلیم کیا جائے۔ یہ چیز شرک ہے۔ اس کے شرک ہونے کے دلائل ہم نے اپنے رسائل حقیقت شرک اور حقیقت توحید میں بیان کیے ہیں۔

تیسری چیز نماز ہے۔ نماز کے لیے 'اقامت' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے اندر اہتمام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ نماز کا حکم اللہ کے ذکر کو قائم و دائم رکھنے کے لیے دیا گیا ہے۔ 'اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ' نماز انفرادی ہو یا اجتماعی خدا کے ذکر کی سب سے بڑی محافظ بھی ہے اور اس کا سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ مؤثر مظہر بھی۔ اسی وجہ سے تمام انبیاء کو توحید کی تعلیم کے بعد سب سے پہلے اسی کی ہدایت ہوئی۔ نماز ہی کے ذریعہ سے بندہ اپنے عہد بندگی کو یاد کرتا ہے جو اس کے رب نے اس سے لیا ہے اور جو اپنے رب سے اس نے باندھا ہے اور اسی کے ذریعہ سے کوئی امت اپنے اس میثاق کو یاد رکھتی ہے جو خدا نے اس سے لیا ہے اور جس کا خدا سے اس نے اقرار کیا ہے۔ اگر کوئی فرد یا امت نماز کو ضائع کر دے تو اس نے پورے دین کو ضائع کر دیا۔ اس مضمون کی وضاحت سورۂ مریم کی آیت ۵۹ کے تحت ہو چکی ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى (۱۵)

قیامت کی یاددہانی

یہ قیامت کی یاددہانی ہے اور اس کے لیے 'اٰتِیَۃٌ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ وہ آئے گی، بلکہ یہ فاعل کا صیغہ ہے جس کے اندر زور اور تاکید ہے کہ یہ آکے رہے گی، یہ شدنی اور اٹل ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قیامت کے باب میں عام ذہن کبھی انکار صریح کا نہیں بلکہ تعجب اور استبعاد کا رہا ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کے اثبات کے پہلو بہ پہلو اس کی قطعیت پر بہت زور دیا ہے۔

قیامت کا مقصد

'لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰی' یہ قیامت کا اصل مقصد بیان ہوا ہے کہ اس کا آنا اس لیے لابدی ہے کہ ہر جان کو اس کی کمائی کا، نیک ہو یا بد، بدلہ دیا جانا ناگزیر ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا ایک رحیم و حکیم کی بنائی ہوئی دنیا نہیں بلکہ ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے اور یہ بات بالبداہت خلاف عقل ہے۔ 'بِمَا تَسْعٰی' کے الفاظ نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے عمل ہی کا بدلہ پائے۔ اگر کسی کے اعمال تو ہوں شیطان کے لیکن وہ کسی کی سعی و سفارش یا اپنے حسب نسب کے بل پر مرتبہ صالحین و ابرار کا حاصل کر لے یا باز پرس سے بری ہو جائے تو اس کے معنی نعوذ باللہ یہ ہوں گے کہ اللہ میاں کے ہاں بھی اصل قدر عمل اور کردار کی نہیں بلکہ

شفاعت و سفارش اور خاندان و نسب ہی کی ہے۔

ایک بلیغ جملۂ معترضہ

آیت کے بیچ میں 'اَکَادُ اُخْفِیْھَا' کے الفاظ بطور جملہ معترضہ کے ہیں۔ یہ جملہ معترضہ نہایت بلیغ ہے۔ صرف یہ نہیں فرمایا کہ میں قیامت کو چھپائے رکھوں گا بلکہ فرمایا کہ قریب ہے کہ میں اس کو چھپائے ہی رکھوں۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ لفظ 'اَکَادُ' سے جملہ کے اندر یہ مضمون پیدا ہو گیا ہے کہ ہر چند میں نے تو ابھی قیامت پر پردہ ڈال رکھا ہے اور یہ پردہ ابھی ڈالے ہی رکھوں گا لیکن خود قیامت کا یہ حال ہے کہ وہ بے نقاب ہو جانے کے لیے بالکل بے قرار ہے۔ یہی مضمون دوسرے الفاظ میں سورۂ اعراف میں یوں وارد ہوا ہے 'ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً' (آسمان و زمین دونوں اس کے بوجھ سے گرانبار ہیں، وہ تمہارے اوپر بس اچانک ہی آ دھمکے گی)[1]

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى (۱۶)

ایجاز بیان کی ایک مثال

'عَنْهَا' میں ضمیر کا مرجع ہمارے نزدیک 'صَلٰوۃ' ہے اور 'بِهَا' کی ضمیر کا مرجع 'السَّاعَة' ہے۔ یعنی نماز سے تمہیں وہ شخص روکنے یا غافل نہ کرنے پاوے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں کا پیرو ہے۔ یہ مفہوم لینے میں اگرچہ بظاہر انتشارِ ضمیر کا سوال پیدا ہوتا ہے جس کو کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے لیکن انتشارِ ضمیر صرف اس صورت میں عیب ہے جب مرجع کے تعین کے لیے کوئی واضح قرینہ موجود نہ ہو۔ اگر واضح قرینہ موجود ہو تو یہ کوئی عیب نہیں بلکہ اس سے کلام میں ایجاز کا حسن پیدا ہوتا ہے اور فصحا کے کلام میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں موجود ہیں۔

یہاں قرینہ بالکل واضح ہے۔ نماز اور قیامت کے ذکر کے بعد دو فعل استعمال ہوئے ہیں ایک 'يَصُدَّنَّ' اور دوسرا 'يُؤْمِنُ'۔ زبان کا ذوق رکھنے والا شخص بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ پہلا فعل 'صَلٰوۃ' سے واضح مناسبت رکھتا ہے اور دوسرا قیامت سے۔ یہی رائے اگلوں میں سے ابو مسلم کی ہے اور مجھے یہ رائے ہر اعتبار سے صحیح معلوم ہوتی ہے۔

نماز اور ایمان بالآخرۃ کا باہمی تعلق

حکمتِ دین کے پہلو سے اس مسئلہ پر غور کیجیے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص آخرت پر پختہ ایمان نہیں رکھتا اس کے لیے نماز ایک مصیبت ہے۔ قرآن میں اس کی تصریح موجود ہے۔

- وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (بقرہ - ۴۵-۴۶)

اور بے شک یہ بہت گراں ہے مگر ان ڈرنے والوں پر جو یہ گمان رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی سے ان کو سابقہ پڑنے والا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی قرآن میں موجود ہے کہ اتباعِ ہوا اور ترکِ نماز میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ سورۂ مریم میں یہ آیت گزر چکی ہے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا — پس ان کے بعد ایسے برے جانشین اٹھے جنھوں نے

---

[1] اس مضمون کی مزید وضاحت مطلوب ہو تو اس آیت کی تفسیر 'تدبرِ قرآن' جلد سوم صفحہ ۴۰۴ پر ملاحظہ فرمائیے۔

الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوٰتِ فَسَوْفَ — نماز ضائع کر دی اور خواہشوں کے پیرو بن گئے تو وہ عنقریب

یَلْقَوْنَ غَیًّا (۵۹۔ مریم) — اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

یہود نماز اور ایمان بالآخرۃ دونوں ضائع کر بیٹھے

ان آیات سے یہ بات واضح ہوئی کہ حضرت موسیٰؑ کو توحید کی تعلیم کے بعد سب سے پہلے جس چیز کی تاکید ہوئی وہ نماز ہے اور خاص طور پر جس چیز کی یاددہانی کی گئی وہ آخرت ہے۔ یہی بات حضرات انبیائے کرام کی تاریخ سے، جیسا کہ سورۂ مریم میں آپ معلوم کر چکے ہیں، ہم آہنگ بھی ہے لیکن یہود کی بدقسمتی قابلِ ماتم ہے کہ انھوں نے نماز بھی ضائع کر دی اور آخرت کو بھی کھلا بیٹھے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ ان کے صحیفوں میں قربانی کا ذکر تو ملتا ہے لیکن نماز کا ذکر، بالخصوص ہیکل میں، صرف ایک جگہ سفر خامس باب ۲۶ میں ملتا ہے۔ ان کے بعض فقہاء کا خیال تو یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نماز کا حکم سرے سے دیا ہی نہیں، اگر تورات میں اس کا کہیں ذکر ہے تو وہ بعد کے مرتبوں کی ایجاد ہے۔ رہا آخرت کا معاملہ تو ان کے صدوقی تو حشر بعد الموت کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جزا و سزا جو کچھ ہے سب اسی دنیا میں پوری ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں مرجئہ نے بھی اپنا عقیدہ معلوم ہوتا ہے کہ انہی سے مستعار لیا ہے۔

آخر میں لفظ فَتَرْدٰی بطور تنبیہ ہے کہ اگر نماز اور یادِ آخرت سے غفلت ہوئی تو سمجھ لو کہ بیڑا غرق ہو جائے گا۔ یہی چیزیں سارے دین کی حفاظت کرنے والی اور شیطان کے فتنوں سے امان میں رکھنے والی ہیں۔ جو ان سے غافل ہوا اس نے گویا اپنے آپ کو شیطان کے حوالہ کر دیا۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (۱۷)

لفظ یمین دہنے بائیں کے مفہوم سے مجرد ہو کر صرف ہاتھ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ کلام عرب میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

سوال برائے التفات و نوازش

یہ سوال ظاہر ہے کہ تحقیق کے لیے نہیں بلکہ اظہارِ التفات و نوازش ہی کے لیے ہو سکتا ہے۔ جس طرح باپ بچے سے پوچھتا ہے کہ بیٹے یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے حالانکہ وہ اس چیز سے بیٹے سے زیادہ واقف ہوتا ہے اسی طرح ربِ کریم نے حضرت موسیٰؑ سے سوال کیا کہ موسیٰ! یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے؟ اور سوال اس چیز سے متعلق کیا جو آگے ان تمام خوارق کا ذریعہ بننے والی تھی جو حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں ظاہر ہوئے۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى (۱۸)

'ھش' کے معنی

'ھش' کے معنی درخت سے پتے جھاڑنے کے ہیں۔ عکبری نے 'اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ' کے معنی 'اَقُوْمُ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ' کے لیے ہیں۔ یعنی اس لٹھیا سے میں اپنے ریوڑ کی چرواہی اور حفاظت کرتا ہوں۔ اگر لغت سے اس معنی کی شہادت مل جاتی تو بہت خوب ہے لیکن عکبری نے کوئی شہادت نہیں پیش کی ہے۔ اس وجہ سے میں نے معروف معنی ہی کی پیروی کی ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ یہ میری لٹھیا ہے جس پر میں عند الضرورت ٹیک بھی لگاتا ہوں، اپنی بکریوں

کے لیے درختوں سے پتے بھی جھاڑ لیتا ہوں اور میرے دوسرے کام بھی اس سے نکلتے ہیں۔

صاف محسوس ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے سوال کا صرف سیدھا سادا جواب دے دینے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ان کے جواب میں کچھ انبساطِ کلام اور سخن گستری کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ وہ صرف یہ جواب بھی دے سکتے تھے کہ یہ میری لٹھیا ہے لیکن انھوں نے سوال کے انداز سے بھانپ لیا کہ یہ محض سوال نہیں ہے بلکہ اس میں التفاتِ خاص کی دل نوازی بھی ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے جواب میں تفصیل سے کام لیا کہ شاید اس طرح کچھ مزید سوال و جواب کی راہ کھلے۔ مخاطب کرنے والا محبوب و مطلوب ہو تو گفتگو کو طویل کرنے کی خواہش ایک امر فطری ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

قَالَ اَلْقِهَا یٰمُوْسٰی ۔ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی (۱۹-۲۰)

عصا کا معجزہ

ارشاد ہوا کہ اس لٹھیا کو زمین پر ڈال دو اور پھر قدرتِ خداوندی کا کرشمہ دیکھو! چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے لٹھیا زمین پر ڈال دی اور وہ دفعۃً ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گئی۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی (۲۱)

سانپ کو دیکھ کر ڈرنا ایک امر طبعی ہے چنانچہ حضرت موسیٰؑ اس منظر کو دیکھ کر ڈرے کہ ہاتھ کی لٹھیا جو سانپ کو مارنے والی بن سکتی تھی وہ خود سانپ بن گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اطمینان دلایا کہ ڈرو نہیں، اس کو بے جھجک پکڑ لو۔ تمھارے پکڑتے ہی ہم اس کو اس کی پہلی حالت پر کر دیں گے۔ یہ جیسی لٹھیا تھی ویسی ہی لٹھیا بن جائے گی۔

وَاضْمُمْ یَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ اٰیَةً اُخْرٰی (۲۲)

یدِ بیضا کا معجزہ

ساتھ ہی دوسری ہدایت یہ ہوئی کہ اپنے ہاتھ کو اپنی بغل کی طرف سکیڑ لو، پھر جب تم اس کو بغل سے نکالو گے تو وہ وہاں سے چٹا سفید، بغیر کسی مرض کے، ایک دوسری نشانی بن کر برآمد ہو گا۔

تورات کے ایک بیان کی تردید

یہ دوسرا معجزہ تھا جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوا۔ یہاں 'بیضاء' کے ساتھ 'مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ' کی قید اس شبہ کے ازالہ کے لیے ہے کہ یہ ہاتھ کی سفیدی کسی مرض کے سبب سے نہیں ہو گی بلکہ اللہ کی ایک نشانی کے طور پر ہو گی۔ اس سے تورات کی اس روایت کی تردید ہو جاتی ہے کہ جب موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ نکالا تو وہ برص سے سفید نکلا۔ یہ امر بھی یاد رکھیے کہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ کی یہ سفیدی مستقل نہیں تھی بلکہ قرآن کے الفاظ شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ظہور کو اس شرط کے ساتھ خاص کیا تھا کہ جب حضرت موسیٰؑ ایک نشانی کے طور پر دکھانے کے لیے اپنا ہاتھ اپنی بغل میں ڈال کر نکالیں گے تب یہ سفید نکلے گا۔ کسی مرض کا شبہ تو خدانخواستہ اس حالت میں ہوتا ہے جب ہاتھ مستقلاً سفید ہو جاتا۔ لیکن ایسا ہوتا تو پھر معجزہ کیا ہوتا؟

'اٰیَةً اُخْرٰی' مستقل جملہ نہیں ہے بلکہ یہ دوسرا حال ہے۔ ایک حال تو یہ ہے کہ وہ بغیر کسی مرض کے چٹا سفید بن کر نکلے گا، دوسرا حال یہ ہے کہ وہ ایک دوسری نشانی بن کر نکلے گا، ہم نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ۔ (۲۳)

یہ حضرت موسیٰؑ کے لیے مستقبل کی فتوحات کی بشارت ہے کہ بظاہر تو یہ دو ہی معجزے ہیں لیکن یہ دو ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر ہمارے بہت سے دوسرے بڑے بڑے معجزے بند ہیں۔ آگے جب امتحان کے مراحل آئیں گے تو تم دیکھو گے کہ ان سے ہماری قدرت و قہرمانیت کے کیا کیا کرشمے اور خوارق ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرعون کے مقابل میں ان کے جو کرشمے ظاہر ہوئے ان کی تفصیلات تورات میں موجود ہیں۔ خود قرآن میں عصا کے جو کرشمے مذکور ہیں ان کی عظمت ظاہر ہے۔ اسی عصا نے ان کے لیے سمندر سے راہ نکالی اور اسی سے انھوں نے ایک پہاڑی سے اکٹھے بارہ چشمے جاری کر لیے۔

معجزات کے باب میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ خاص معاملہ کی وجہ

توحید اور آخرت اور نماز کی تعلیم و تاکید اور ان دو معجزات کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ وہ فرعون کے پاس فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لیے جائیں اور اس کو خدا اور اس کے غضب سے ڈرائیں وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معجزات کے باب میں معروف سنتِ الٰہی تو یہ رہی ہے کہ وہ حضرات انبیاءؑ کو اس وقت دیے گئے ہیں جب ان کی قوموں نے شدت کے ساتھ ان کا مطالبہ کیا ہے اور مقصود ان کے دیے جانے سے صرف اتمامِ حجت رہا ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لے رہے ہیں، کسی معجزے ہی کے لیے لغت ہیں ان کے پاس حق سے انحراف کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ پھر حضرت موسیٰؑ کے ساتھ یہ خاص معاملہ کیوں ہوا کہ ان کو منصب نبوت پر مامور کرتے ہی دو معجزے دے دیے گئے؟ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ ایک ایسے سرکش اور جابر حکمران کی طرف رسول بنا کر بھیجے جا رہے تھے جو شخصی اور قومی دونوں اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کا جانی دشمن تھا۔ ان کی بات سننا اور سمجھنا تو درکنار اندیشہ اس بات کا تھا کہ یہ علم ہوتے ہی کہ یہ حضرت موسیٰؑ ہیں فوراً ان کے قتل کا حکم دے دیتا۔ بلکہ ان کے قتل کا حکم تو اسی وقت وہ دے چکا تھا جب قبطی کے قتل کا واقعہ پیش آیا تھا لیکن حضرت موسیٰؑ چھپ کر مدین چلے گئے اس وجہ سے وہ اپنے ارادے میں ناکام رہا۔ ایک ایسے منتقم و جبار کے سامنے اگر حضرت موسیٰؑ ایک رسول کی حیثیت انذار کے لیے جاتے تو بھلا وہ ان کی بات سننے کا کب روادار ہوتا! وہ تو صرف اسی شکل میں کوئی بات سننے کے لیے تیار ہو سکتا تھا جب حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں کوئی ایسی بات ظاہر ہوتی جو اس کو مرعوب کر دیتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شروع ہی میں ان کو دو ایسے معجزوں سے مسلح کر دیا جن کی مدد سے وہ اپنے دشمن کی ہر تعدی سے محفوظ رہے اور انھوں نے فرعون کے سامنے جاتے ہی، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہو گا اپنے ان معجزات کا اظہار بھی کر دیا تاکہ وہ خبردار رہے کہ اگر اس نے کوئی غلط اقدام کیا تو وہ بھی خالی ہاتھ نہیں آئے ہیں بلکہ ان کے ہاتھ میں بھی وہ عصا ہے جو ہر کبر و غرور کا سر پاش پاش کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۴)

فرعون کا طغیان

یہ وہ پہلی مہم ہے جس پر حضرت موسیٰؑ مامور فرمائے گئے۔ حکم ہوا کہ فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ فرعون کی سرکشی کی تفصیل سورۂ اعراف کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ وہ اپنے زعم میں خود ربِ اعلیٰ تھا اور مصریوں کے

سب سے بڑے دیوتا ۔ سورج ۔ کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے اسٹیچو اور بت سارے مصر میں پوجے جاتے تھے۔ خدا کے بندوں کے ساتھ اس کا جو معاملہ تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہی بات کافی ہے کہ اس نے اپنی ساری مملکت میں یہ حکم جاری کر رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جتنے بیٹے پیدا ہوں وہ قتل کر دیے جائیں یا دریا میں پھینک دیے جائیں، صرف لڑکیاں لونڈیوں کی خدمت انجام دینے کے لیے زندہ رکھی جائیں۔ جس کا رویہ خالق اور خلق کے ساتھ یہ ہو اس کے طغیان میں کلام کی گنجائش کہاں رہی! حضرت موسیٰ چونکہ اس طغیان سے اچھی طرح باخبر تھے بلکہ وہ خود اس کے ستم زدہ تھے اس وجہ سے یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل نہیں فرمائی بلکہ صرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا۔

انبیاء کی دعوت اور عوامی تحریکات میں ایک اصولی فرق

یہاں وہ بات بھی نگاہ میں رکھیے جس کی طرف ہم ایک سے زیادہ مقامات میں اشارہ کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنے انذار اور اپنی دعوت کا مخاطب سب سے پہلے اپنی قوم اور سوسائٹی کے اعیان و اکابر کو بناتے ہیں اس لیے کہ سوسائٹی کا نظام انہی کی قیادت میں چل رہا ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی اصلاح کو قبول کر لیں تو ساری سوسائٹی بہت جلد اصلاح قبول کر لیتی ہے اور دعوت کی عقلیت و برتری کا رعب سب پر چھا جاتا ہے اور اگر وہ ضد و مکابرت کی وجہ سے حق کو جھٹلاتے ہیں تو یہ چیز بھی دعوت کے حق میں ایک پہلو سے مفید ہی ہوتی ہے اس لیے کہ ان کے پیروؤں پر اپنے لیڈروں کی منطق کا کھوکھلا پن واضح ہو جاتا ہے اور پھر اگر وہ حق قبول کرتے ہیں تو پورے شعور اور کامل بصیرت کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور یہ بصیرت ان کے اندر وہ قوت تسخیر پیدا کر دیتی ہے کہ کل تک اگر وہ دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کی طرح صرف مچھلیوں کے پکڑنے والے تھے تو اس انقلاب حال کے بعد آدمیوں کے پکڑنے والے بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو تحریکیں عوامی پراپیگنڈے سے اپنے کام کا آغاز کرتی ہیں ان کا سارا اعتماد عوام کو بھڑکانے والے جذباتی نعروں پر ہوتا ہے۔ انہی کے بل پر وہ چلتی ہیں اور جب تک قائم رہتی ہیں انہی کے بل پر قائم رہتی ہیں۔ ان کے اندر نہ عقل کا کوئی حصہ ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ جذبات کے ایک مؤثر عامل ہونے سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر انہی کے ہاتھ میں زندگی کی باگ دے دی جائے تو پھر زندگی کا انجام معلوم ہے!

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۝ هَارُونَ أَخِي ۝ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ۝ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ۝ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا ۝ إِنَّكَ كُنتَ بِنَا بَصِيرًا ۝ قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ (۲۵-۳۶)

نبی اور دنیا پرست لیڈروں میں فرق

حضرت موسیٰ کے علم میں جونہی یہ بات آئی کہ ان پر فریضۂ رسالت کی ذمہ داریاں ڈال دی گئی ہیں اور اب انھیں فرعون کے پاس، خدا کے رسول کی حیثیت سے، انذار و تبلیغ کے لیے جانا ہے تو انھوں نے فوراً یہ دعا کی جو اوپر نقل ہوئی ہے۔ اس دعا کے لفظ لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس بوجھ کو کتنا بھاری محسوس کیا ہے اور کس دل سوزی کے ساتھ اس بارگراں کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ سے مدد و رہنمائی کے لیے التجا کی ہے۔ دنیا پرست لیڈروں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ لیڈری ہی کی ہوس میں جیتے اور اسی کے عشق میں مرتے

ہیں لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کا سینہ اس ہوس سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ جب امامت کے منصب پر مامور فرماتا ہے تو وہ اس کی ذمہ داریوں کے تصور سے کانپ اٹھتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ جب اس نے ان پر یہ بوجھ ڈالا ہے تو وہی اس کے اٹھانے کے لیے ہمت و قوت بخشے اور ہر قدم پر دستگیری و رہنمائی فرمائے۔

شرح صدر کی دعا

'قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي'۔ سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ نے شرح صدر کے لیے دعا فرمائی۔ اگر ذمہ داری بھاری ہو اور آدمی کو اس ذمہ داری کا کماحقہٗ احساس بھی ہو تو ہر حساس آدمی کا سینہ اس سے بھنچتا ہے۔ یہ آدمی کی کمزوری کی دلیل نہیں بلکہ یہ اس کے حساس اور فرض شناس ہونے کی دلیل ہے۔ حضرات انبیاءؑ نبوت کو مانگ کر نہیں پاتے بلکہ اس کی ذمہ داری، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی جاتی ہے اس وجہ سے قدرتی طور پر وہ اپنے سینہ میں اضطراب و تردد محسوس کرتے ہیں کہ معلوم نہیں وہ کس حد تک اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سینہ کی یہ خلش اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے دور ہو سکتی ہے۔ وہی دل میں ہمت و عزیمت ڈالتا ہے اور وہی آگے کے مراحل کے لیے علم و یقین کی روشنی عطا فرماتا ہے تب سینہ کھلتا اور حوصلہ بلند ہوتا ہے۔ یہ حقیقت یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاءؑ پر بھی سارا علم و یقین ایک ہی دن میں انڈیل نہیں دیا جاتا بلکہ وہ بھی زاد و راحلہ اپنی منازل سفر کے اعتبار سے پاتے ہیں اور برابر 'رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا' کا ورد رکھتے ہیں۔

مہم کی کامیابی کے لیے دعا

'وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي' اندرونی خلش کے ازالہ کی دعا کے بعد یہ حالات کی ساعدت، راہ کی ہمواری اور مہم کی کامیابی کے لیے دعا ہے کہ ہر چند یہ مہم بہت سخت ہے لیکن تو چاہے تو ہر مشکل کو آسان کر سکتا ہے۔ تو اپنے فضل سے ہر مشکل کو آسان کر اور راہ کی ہر رکاوٹ کو دور کر۔

قوتِ اظہار و بیان عطا کیے جانے کی درخواست

'وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي'۔ یہ نہایت ادب و تواضع کے ساتھ، مقصد دعوت کے لیے، قوتِ اظہار و بیان عطا کیے جانے کی درخواست ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دور میں ابلاغ کا واحد ذریعہ صرف کسی خطیب کی خطابت و زبان آوری ہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں خطیبوں کو سوسائٹی میں سب سے زیادہ عزت حاصل تھی۔ عرب میں تو یہ حال تھا کہ جو شخص قبیلہ کا خطیب ہوتا وہی اس کا زعیم اور قائد ہوتا۔ جو ہر خطابت کے بغیر اس دور میں کوئی شخص قیادت و امارت کی ذمہ داریاں کماحقہٗ ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اب پریس کی ایجاد نے قلم کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے بلکہ اب تو اصلی اہمیت پریس ہی کو حاصل ہے۔ آج اگر کوئی شخص کسی طرح پریس کی مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ ڈیموستھنیز سے بھی بڑا خطیب و زبان آور ہونے کا مدعی بن سکتا ہے اگرچہ وہ دو فقرے بھی صحیح بولنے پر قادر نہ ہو۔ لیکن پریس کی ایجاد سے پہلے خطابت اور زبان آوری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بالخصوص جن کے اوپر عوام کی قیادت و امارت کی ذمہ داری ہو وہ تو اس قابلیت کے بغیر اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام زبان آور خطیب نہیں تھے۔ خطابت و زبان آوری ہر چند نبوت و رسالت کے لوازم

میں سے نہیں ہے لیکن دعوت و تبلیغ کے اعتبار سے اس کی اہمیت، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بالخصوص اُس دور میں بہت تھی، اس وجہ سے جب ان پر ... کی ذمہ داری ڈالی گئی تو ان کو اپنی اس کمی کا احساس ہوا اور شرح صدر کی دعا کے ساتھ انھوں نے اظہ... قوت بخشے جانے کی بھی دعا فرمائی کہ اے رب میری زبان کو قوت اور روانی عطا فرما تاکہ میں اپنی دعوت کو اس طرح پیش کر سکوں کہ لوگ میری بات کو سنیں اور سمجھیں۔

اپنی اس کمی کے احساس کی وجہ سے انھوں نے اپنے بڑے بھائی حضرت ہارُونؑ کو اپنا شریک کار بنائے جانے کے لیے دعا بھی کی۔ حضرت ہارونؑ تورات اور قرآن مجید دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت زوردار خطیب تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو بجا طور پر یہ توقع تھی کہ اگر ان کا تعاون حاصل ہو گیا تو جس کمی کا وہ اپنے اندر احساس کر رہے ہیں اس کی تلافی ہو جائے گی۔ سورۂ قصص میں ان کی دعا یوں مذکور ہے۔

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ	اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے
لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْٓ	تو اس کو ایک معاون کی حیثیت سے میرے ساتھ بھیجیے
اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ۔	کہ وہ میری تائید کرے مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ میری
(القصص - ۳۴)	تکذیب کریں گے۔

اس آیت سے یہ بات صاف واضح ہے کہ اصل ضرورت جس کو حضرت موسیٰؑ، مقصدِ دعوت کے لیے محسوس فرما رہے تھے ایک زوردار خطیب کی تھی۔ اس پہلو سے وہ اپنے اندر ایک کمی محسوس فرماتے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنے سے زیادہ ایک فصیح البیان خطیب کی ان کو مدد حاصل ہو جائے تاکہ وہ زیادہ بہتر اور مؤثر طریقے پر لوگوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کر سکیں۔

یہی بات سورۂ شعراء میں یوں مذکور ہوئی ہے۔

وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ	اور میرا سینہ بھنچتا ہے اور میری زبان رواں نہیں ہے
فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ (۱۳ - شعراء)	تو ہارون کے پاس پیغام بھیج۔

کیا حضرت موسیٰؑ میں لکنت تھی؟

ان آیات سے یہ بات تو ضرور معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کوئی زبان آور اور زوردار خطیب نہیں تھے لیکن یہ بات کہیں سے نہیں نکلتی کہ ان کی زبان میں لکنت تھی۔ لکنت کی روایت صرف تورات میں ہے۔ وہیں سے ہماری تفسیر کی کتابوں میں داخل ہوئی اور پھر اس کو مستند کرنے کے لیے ہمارے مفسرین نے ایک عجیب و غریب واقعہ بھی گھڑ لیا۔ تورات کی روایات کا جو حال ہے ان کا اندازہ اوپر آپ کر چکے کہ حضرت موسیٰؑ کے 'ید بیضاء' کو برص کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ جو لوگ اپنے نبی کو برص کا مریض قرار دے سکتے ہیں ان سے کیا بعید ہے اگر وہ اس کے اندر لکنت کا عیب بھی نکال دیں!

بہرحال قرآن میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے لکنت کا ثبوت ملتا ہو۔ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ، کے الفاظ میں بھی جس بات کی درخواست ہے وہ لکنت دور کرنے کی نہیں بلکہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا،

اظہار و بیان کی وہ قابلیت و صلاحیت بخشے جانے کی درخواست ہے جو وظیفۂ نبوت و رسالت کی ادائیگی کے لیے ضروری تھی۔ اور یہ درخواست نہایت متواضعانہ اسلوب و الفاظ میں ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے یوں نہیں فرمایا کہ مجھے دلوں کو تسخیر کرنے والا ایک جادو بیان خطیب بنا دے بلکہ نہایت خاکسارانہ انداز میں فرمایا کہ میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھیں۔ یہ دعا کرنے کے لیے لکنت کا مریض ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک قادر الکلام بھی یہ دعا کرتا ہے اور اسے کرنی چاہیے۔ بسا اوقات معانی و حقائق کا جوش اس طرح سینہ میں امنڈتا ہے کہ ایک قادر الکلام آدمی بھی اپنی زبان اور اپنے قلم کو اس کی تعبیر سے قاصر محسوس کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ کو عام لیڈروں کی طرح صرف نعرہ نہیں لگانا تھا بلکہ دین کے حقائق و اسرار کی تفہیم کرنی تھی اور وہ بھی ایسے لوگوں کے سامنے جو نہ صرف ان کی تکذیب پر ادھار کھائے بیٹھے تھے بلکہ ان کی جان کے دشمن تھے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ حضرت موسیٰ کو صرف چھدّا اتارنے کی خواہش نہیں تھی بلکہ وہ اپنے مخالفوں کے دل میں اتر جانے کا ارمان رکھتے تھے۔ مخالفوں سے تو یہ امید نہ تھی کہ ان کے دل اور ہو جائیں گے اس لیے انھوں نے اپنے رب سے زبان ہی اور مانگی تاکہ ان کو اپنی بات سمجھا سکیں۔

الغرض ہمارے نزدیک یہ لکنت کی روایت ناقابلِ اعتبار ہے۔ قطع نظر اس سے کہ حضرات انبیاء کو اللہ تعالیٰ جس طرح اخلاقی عیوب سے محفوظ رکھتا ہے اسی طرح خلقی نقائص سے بھی محفوظ رکھتا ہے، سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی بات یہ ہے کہ قرآن میں اس روایت کی تائید کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ فرعون کا طعنہ جو سورۂ زخرف میں لَا یَکَادُ یُبِیۡنُ کے الفاظ سے نقل ہوا ہے اس پر ان شاء اللہ ہم اس کے محل میں بحث کریں گے۔

وَاجۡعَلۡ لِّیۡ وَزِیۡرًا مِّنۡ اَهۡلِیۡ ۝ هٰرُوۡنَ اَخِی ۝

حضرت ہارونؑ کو شریک کار بنانے کی دعا کی وجہ

اوپر سورۂ قصص اور سورۂ شعراء کی جن آیتوں کا حوالہ گزرا ہے اس سے یہ بات واضح ہے کہ ایک مددگار اور شریکِ کار کی ضرورت خاص طور پر حضرت موسیٰ نے اپنی قوتِ بیان کی کمی کے پہلو سے فرمائی تھی اور اس کمی کی تلافی کے لیے وہ اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو نہایت موزوں آدمی سمجھتے تھے، وہ ان کے بڑے بھائی بھی تھے، ان کے اخلاق و کردار پر بھی حضرت موسیٰ کو پورا بھروسا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی فصاحتِ بیان کی، جیسا کہ تورات سے واضح ہے، قوم میں بڑی شہرت تھی۔ ان تمام صفات سے متصف آدمی جب اپنے ہی گھر اور خاندان میں موجود ہو تو سب سے زیادہ وہی اس بات کا حق دار ہو سکتا تھا کہ اس کے شریکِ کار بنائے جانے کے لیے حضرت موسیٰؑ درخواست کریں۔ 'مِّنۡ اَهۡلِیۡ' کے لفظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس انتخاب میں کسی خاندانی عصبیت کو دخل تھا۔ خاندانی عصبیت کا شبہ تو اس صورت میں ہوتا جب مجرد خاندان وجہ ترجیح بنتا لیکن جب وجہ انتخاب صفات ہیں تو نہ صرف یہ کہ اس شبہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے جب کسی فضل و رحمت کے لیے دعا کرے تو اس میں سب سے پہلے اپنے اہل و عیال کو شریک کرے بشرطیکہ وہ اہل و صالح ہوں۔ بقرہ کی تفسیر میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

حضرت ہارونؑ کی حیثیت

اُشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِیۡ ۝ وَاَشۡرِكۡهُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ۝ 'اَزۡر' پیٹھ اور کمر کو کہتے ہیں۔ یعنی ہارونؑ کو

میرا وزیر اور شریک کار بنا کر میری کمر کو مضبوط کر تا کہ میں اس بارگراں کو حسن و خوبی کے ساتھ اٹھا سکوں۔ 'وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ' سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی درخواست اس بات کے لیے تھی کہ حضرت ہارونؑ کی مدد صرف ایک صحابی اور ساتھی کی حیثیت سے نہیں بلکہ شریک نبوت کی حیثیت سے حاصل ہو۔ یعنی وہ بھی فرائض نبوت سے متعلق عنداللہ مسئول و ذمہ دار ہوں اور انھیں بھی براہِ راست اللہ کی طرف سے رہنمائی اور عصمت حاصل ہو۔

یہ درخواست ایک بڑی اہم درخواست تھی اس لیے کہ حضرات انبیاؑ میں سے، جیسا کہ سورۂ مریم کی آیت ۵۳ کے تحت ہم ذکر کر چکے ہیں، کسی نبی کے متعلق یہ بات معلوم نہیں کہ ایک دوسرا نبی اس کا وزیر بنایا گیا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو یہ شرف بخشا اور ان کی یہ درخواست منظور فرمائی۔ دنیادار لیڈروں میں تو چھوٹے چھوٹے عہدوں کے لیے بھی رشک و رقابت کا وہ جذبہ ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کو اپنے اختیارات کے قریب پھٹکنے دینے کے روادار نہیں ہوتے لیکن جہاں امانت اور ذمہ داری کا صحیح احساس ہو تو ایک نبی اپنی نبوت کے منصب عظیم میں بھی دوسرے کو شریک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے۔

یہاں یہ بات نوٹ رکھیے کہ تورات میں حضرت ہارونؑ کا ذکر اس حیثیت سے نہیں آیا ہے جس حیثیت سے قرآن میں آیا ہے۔ تورات میں ان کا ذکر بس حضرت موسیٰؑ کے ایک ساتھی اور ترجمان کی حیثیت سے آیا ہے اور وہ بھی ایک ایسے ساتھی کی حیثیت سے کہ سامری کی فتنہ انگیزیاں بھی انہی کے کھاتے میں ڈال دی گئی ہیں۔ یہ قرآن کا فیض ہے کہ اس نے ان شخصیتوں کی اصلی حیثیت اُجاگر کی ہے۔

'ذکر' کا مفہوم

'كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا' (۳۳-۳۴)۔ یعنی ہارونؑ کو شریک کار بنائے جانے کی درخواست اس لیے ہے کہ ہم دونوں مل کر تیری زیادہ سے زیادہ تسبیح اور تیرا زیادہ سے زیادہ ذکر کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں انفرادی ذکر و تسبیح ہی مراد نہیں ہے بلکہ اجتماعی ذکر و تسبیح بھی مراد ہے اور یہ تعبیر ہے فریضۂ نبوت کی ادائیگی کی۔ نبی اور انبیاء کے طریقہ پر کام کرنے والوں کی خلوت و جلوت دونوں ذکر و تسبیح ہوتی ہے۔ وہ مسجد میں جو کام کرتے ہیں وہ بھی ذکر و تسبیح ہے اور بازار میں جو کام کرتے ہیں وہ بھی ذکر و تسبیح ہے۔ ان کی رزم و بزم دونوں میں فرق عمل کا نہیں بلکہ صرف میدانِ عمل کا ہوتا ہے۔ اس سورہ کی آیت ۱۴ میں آپ نے پڑھا ہے کہ 'اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ' (میرے ذکر کے لیے نماز کا اہتمام رکھنا) اور پھر اسی سورہ کی آیت ۴۲ میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں حضرات کو فرعون کے دربار میں جانے اور ساتھ ہی اس بات کی ہدایت ہوتی ہے کہ 'وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ' (اور میرے ذکر میں ڈھیلے نہ پڑنا) ظاہر ہے کہ اس ذکر سے مراد وہ انذار و تبلیغ ہی ہے جس کے لیے وہ فرعون کے پاس بھیجے جا رہے تھے۔

تسبیح اور ذکر میں ایک نازک فرق

تسبیح اور ذکر دونوں لفظوں کے ایک ساتھ ذکر کرنے میں ایک ادبی پہلو بھی ملحوظ ہے، وہ بھی نگاہ میں رہے۔ تسبیح میں تنزیہ کا پہلو غالب ہے اور ذکر میں اثبات کا اور یہ نفی و اثبات دونوں خدا کے ساتھ صحیح تعلق کو استوار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ جو چیزیں خدا کی شان، اس کی صفات اور اس کی مرضیات و احکام کے منافی ہیں ان

کی نفی کی جائے اور جو چیزیں اس کی شان، اس کی صفات اور اس کے احکام کے موافق ہیں ان کا اثبات و اظہار کیا جائے۔ ان دونوں چیزوں سے مل کر مومن کا عقیدہ اور کردار بنتا ہے۔ اور نفی اثبات پر مقدم ہے۔ جب تک آپ ماسوی اللہ سے لبادت کا اعلان نہیں کرتے اس وقت تک آپ اللہ کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ اِلَّا اللّٰہُ سے پہلے لَآ اِلٰہَ کا اعلان ضروری ہے۔

دعا کے حق میں ایک سفارش

اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا، یہ اپنی اس دعا کے حق میں اسی طرح کی سفارش ہے جس طرح کی سفارش حضرت زکریاؑ نے اپنی دعا کے حق میں، مَا كُنْتُ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا، کے الفاظ سے پیش کی ہے۔ سورۂ مریم کی تفسیر میں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ خدا کی بارگاہ میں آدمی کے لیے بہترین سفارش اس کا اپنا عمل نہیں ہے بلکہ خود خدا ہی کے فضل و کرم کا واسطہ ہے۔ جب بندہ اس اعتماد پر اپنے رب سے مانگتا ہے کہ جس نے بن مانگے سب کچھ بخشا ہے وہ بھلا مانگنے پر کس طرح محروم فرمائے گا تو رب کریم اپنے بندے کو محروم نہیں رکھتا۔ حضرت موسیٰؑ نے بھی اپنے اور اپنے بھائی کے ساتھ اپنے رب کے اسی معاملے کا حوالہ دیا ہے کہ جب تو ہمیشہ ہمارا نگران حال رہا ہے تو اب جب کہ ہم تیرے ہی نام کی خاطر اٹھ رہے ہیں بھلا تیرے فضل و کرم سے کیوں محروم رہیں گے!

درخواست منظور

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى، 'سؤل' اور 'سوال' کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی درخواست اور التجا۔ ارشاد ہوا کہ موسیٰ! تمھاری درخواست منظور ہوئی۔ یہاں موسیٰ کے خطاب میں بھی بڑا پیار ہے اور منظوری کے الفاظ میں بھی بڑی شان جھلک رہی ہے۔ دعا کے الفاظ ختم ہوتے ہی بشارت سنا دی گئی کہ تمھاری عرضی منظور! گویا بیک جنبشِ قلم، بلا کسی توقف اور بلا کسی استثناء کے سب منظور! ظاہر ہے کہ اس منظوری میں ان کی وہ درخواست بھی شامل ہے جو انھوں نے اظہار و بیان کی قوت بخشے جانے کے لیے کی۔ وہ بھی ان کو عطا ہوئی اور حضرت ہارونؑ ان کے وزیر بھی بنا دیے گئے۔ دعا اگر صحیح مقصد کے لیے، صحیح وقت پر، سچے جذبے کے ساتھ کی جائے تو وہ خدا کی بارگاہ سے اسی طرح شرفِ قبولیت پاتی ہے!

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ۝ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ۝ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّىْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِىْ (۳۷-۳۹)

ماضی کے ایک فضلِ خاص کی یاددہانی

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ الآیۃ۔ حضرت موسیٰؑ کا اضطراب رفع کرنے کے لیے جس طرح ان کی دعا کی قبولیت کی بشارت سنائی گئی اسی طرح ان کے اوپر اپنے اس فضلِ خاص کی بھی یاددہانی فرما دی جو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس وقت فرمایا جب ان کی ولادت ہوئی اور اس بات کا خطرہ تھا کہ فرعون اسرائیلی بچوں کے قتل کی جو ظالمانہ اسکیم[1]

---

[1] یہ ظالمانہ اسکیم جن سیاسی خطرات کی بنا پر فرعون اور اس کے درباریوں نے چلائی تھی ان کی وضاحت سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ اعراف آیات ۱۰۹-۱۱۲۔

حضرت موسیٰؑ کی حفاظت کے لیے خدائی انتظامات

چلا رہا ہے اس کی زد میں وہ بھی آ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت نہ صرف یہ کہ اپنی قدرت و حکمت سے حضرت موسیٰ کو بچایا بلکہ فرعون ہی سے ان کی پرورش کرائی۔ اس واقعہ کی یاددہانی سے مقصود یہ ہے کہ جس فرعون سے تمھاری حفاظت کے لیے خدا کی یہ شانیں ظاہر ہو چکی ہیں اس سے کوئی اندیشہ تمھارے دل میں کیوں خطور کرے۔ تمھارا رب تمھارے ساتھ ہے۔

'اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّکَ مَا یُوْحٰٓی' یہ اس فضل خاص کی تفصیل بیان ہو رہی ہے کہ تمھاری حفاظت کے لیے ہم نے جو تدبیر پسند فرمائی اس کی وحی ہم نے تمھاری ماں کی طرف کی اور وہ وحی یہ تھی جو اب تمھیں وحی کی جا رہی ہے تاکہ تم پر واضح ہو جائے کہ ہم اس سے پہلے تمھارے اوپر اپنے کیسے بڑے بڑے فضل کر چکے ہیں۔ اگرچہ اس واقعہ کا اجمالی علم حضرت موسیٰ کو اپنی والدہ ماجدہ کے ذریعہ سے رہا ہوگا لیکن اس کے اندر دست غیب کی جو کارفرمائیاں تھیں ان کا پورا علم تو اس وحی کے ذریعہ ہی سے حضرت موسیٰ کو ہوا ہوگا۔ اسی بات کی طرف 'مَا یُوْحٰٓی' کا لفظ اشارہ کر رہا ہے۔

حضرت موسیٰ کی والدہ کو کیا وحی کی گئی؟

حضرت موسیٰ کی ماں کو جو وحی آئی وہ تو ظاہر ہے کہ القاء اور الہام کی نوعیت کی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک بات ان کے دل میں ڈال دی اور انھیں یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ یہ خدا کی ڈالی ہوئی بات ہے۔ 'اَنِ اقْذِفِیْہِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْہِ فِی الْیَمِّ' یہ وہ وحی ہے جو حضرت موسیٰ کی والدہ کو کی گئی۔ تورات کی کتاب خروج ۲: ۲-۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں حضرت موسیٰؑ کی ولادت ہوئی ہے اس زمانے میں اسرائیلی بچوں کے قتل کی اسکیم بڑے زوروں سے چل رہی تھی۔ حضرت موسیٰ کی والدہ نے کچھ عرصہ تک (تورات کی روایت کے مطابق تین ماہ تک) تو بچے کو ظالموں سے چھپائے رکھا لیکن ان کو ہر وقت یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ اگر ظالم فرعونیوں کو پتہ چل گیا تو بچے کی خیر نہیں۔ تورات کی روایت یہ ہے کہ بالآخر انھوں نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا بنایا اور بچے کو اس میں ڈال کے ٹوکرے کو دریا کے کنارے پر جھاڑ کے نیچے رکھ دیا کہ شاید اس طرح کسی رحمدل کی نظر بچے پر پڑ جائے اور اس کی جان بچنے کی کوئی شکل نکل آئے۔ قرآن کا بیان یہ ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی ماں کے دل میں ڈالی کہ بچے کو ایک صندوق میں رکھ کر اس کو دریا میں ڈال دو اور اس باب میں کوئی فکر یا غم نہ کرو، ہم پھر بچے کو تمھاری طرف لوٹائیں گے اور اس کو اپنا رسول بنائیں گے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ بغیر اشارۂ غیبی کے حضرت موسیٰ کی والدہ آخر کس دل و جگر سے اتنا بڑا اقدام کر سکتی تھیں؟ اشارۂ غیبی کے بعد بھی نہ جانے ان کی مامتا پر کیا کچھ گزری ہوگی لیکن اس اشارۂ غیبی نے چونکہ یہ اطمینان بھی دلا دیا تھا کہ تم یہ کر گزرو، اللہ تعالیٰ بچے کی حفاظت کا سامان خود کرے گا، اس وجہ سے انھوں نے کلیجہ پر پتھر رکھ کر اس کو دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا۔ سورہ قصص آیت ۷ میں اس اشارۂ غیبی کی وضاحت یوں ہوئی ہے۔ 'فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْہِ فَاَلْقِیْہِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْہُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ' (اور جب تمھیں اس کے باب میں اندیشہ ہو تو اس کو دریا میں ڈال دیجیو، اور نہ ڈریو نہ غم کیجیو، ہم پھر اس کو تمھاری طرف لوٹائیں گے

اور اس کو اپنے رسولوں میں سے بنائیں گے) اس اقدام کے وقت حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے دل پر جو کچھ گزری، ہے اس کی وضاحت سورۂ قصص کی تفسیر میں انشاء اللہ ہم کریں گے۔

فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ: یہ اس وحی کا جزو نہیں ہے جو حضرت موسیٰؑ کی ماں کو ہوئی۔ اگر یہ بات بھی وحی میں شامل ہوتی تو اس کی صورت جواب امر کی ہوتی حالانکہ فَلْيُلْقِهِ پر لام امر ہے اس وجہ سے یہ امر غائب ہے۔ جن لوگوں نے اس کا ترجمہ جواب امر کا کیا ہے ان کا ترجمہ بالکل غلط ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ "پس چاہیے کہ دریا اس کو کنارے پر ڈال دے"۔ یعنی والدۂ حضرت موسیٰؑ کو تو اللہ تعالیٰ نے یہ وحی کی کہ بچے کو صندوق میں رکھ کے دریا کے حوالہ کر دو اور دریا کو یہ حکم فرمایا کہ وہ اس کو کنارے پر ڈال دے، اس کو وہ اٹھائے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے۔ یہ حضرت موسیٰؑ پر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت اور اپنی شان و تدبیر کا اظہار فرمایا ہے کہ ہم نے تمھاری حفاظت و پرورش کے لیے اپنی یہ شان دکھائی کہ تمھاری ماں سے تمھیں دریا کی موجوں کے حوالہ کرایا اور پھر لوں چاہا کہ دریا تمھیں ساحل پر ڈال دے اور اس طرح میرا اور تمھارا دونوں کا جو دشمن ہے یعنی فرعون وہ تمھاری پرورش کرے۔ ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

قدرت کا کرشمہ!

عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ: یہ خدا کے کمال تصرف کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور حضرت موسیٰؑ دونوں کے دشمن سے حضرت موسیٰؑ کی حفاظت و پرورش کرائی۔ خدا کا دشمن تو وہ اس وجہ سے تھا کہ وہ خود خدائی کا مدعی تھا، بھلا وہ اپنے سوا کسی اور خدا کو کس طرح گوارا کر سکتا تھا اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس کو جو دشمنی تھی اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ پھر یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور حضرت موسیٰؑ دونوں کے دشمن سے حضرت موسیٰؑ کی پرورش کرائی بلکہ اس کی تدبیر و حکمت کا یہ بھی ایک کرشمہ ہے کہ اس نے فرعون سے اس کے اور اس کی قوم کے سب سے بڑے دشمن کی پرورش کرائی اور فرعون نے خود اپنے ہی ہاتھوں اس خطرے کا سامان کیا جس سے بچنے کے لیے اس نے نہ جانے کیا کیا جتن کیے!

حضرت موسیٰؑ پر محبتِ الٰہی کا پرتو

وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي: یہ وہ خدائی تدبیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے اور ان کے، دونوں کے دشمن کی نگاہوں میں محبوب بنا دینے کے لیے فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ ہم نے تم پر اپنی محبت کا ایک پرتو ڈال دیا۔ بچہ تو یوں ہی موہنا ہوتا ہے، ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر اس کو دیکھ کر شفقت پیدا ہوتی ہے۔ اور حضرت موسیٰؑ تو، تورات کی روایات سے ثابت ہے کہ نہایت خوب صورت بھی تھے[1] پھر مزید لطف خداوندی یہ ہوا کہ ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا پرتو ڈال دیا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس بچے کے موہنے پن کا جس پر محبتِ الٰہی کا پرتو ہو! ایک ایسا موہنا بچہ جب وہ سرکنڈوں کی ایک ٹوکری میں، دریا کی موجوں کا پھینکا ہوا، یکہ و تنہا، معصومیت و دل آویزی کی مورت بنا ہوا پڑا ہو تو آخر کس کا دل اس کو دیکھ کر تڑپ نہیں

---

[1] ملاحظہ ہو خروج ۲:۲۔ عبرانیوں ۱۱: ۲۳۔ اعمال ۷: ۲۰

جائے گا! فرعون آخر فرعون ہی تھا، کوئی پتھر تو نہیں تھا! چنانچہ یوں ہوا کہ فرعون اور اس کی بیوی نیل کے کنارے سیر کو نکلے، ان کی نظر ٹوکرے پر پڑ گئی۔ اس میں انھوں نے ایک چاند سے بچے کو دیکھا۔ سمجھ گئے کہ یہ کسی اسرائیلی کا بچہ ہے جس کو غالباً اس کے ماں باپ نے، اس کے قتل کے اندیشہ سے، تن بہ تقدیر، دریا کی موجوں کے حوالہ کر دیا ہے کہ شاید اسی راہ سے اس کے بچاؤ کی کوئی شکل پیدا ہو جائے۔ بچہ کو دیکھ کر ان کے دل میں رحم پیدا ہو گیا۔ اس رحم میں بھی زیادہ دخل فرعون کی بیوی[1] کو تھا۔ عورتیں یوں بھی فطرۃً بچوں کے معاملے میں بڑی رحمدل ہوتی ہیں اور فرعون کی یہ بیوی تو، جیسا کہ سورۂ تحریم کی آیت ۱۱ سے ثابت ہے نہایت خدا ترس اور رحم دل بی بی تھیں۔ بہرحال اس خدائی تدبیر سے، دریائے نیل میں پھینکے ہوئے حضرت موسیٰؑ، اسی فرعون کے محل میں پرورش کے لیے پہنچ گئے، جس کے ڈر سے ان کی ماں نے اپنی آغوش سے جدا کر کے ان کو دریا کی آغوش میں دیا تھا!

'وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ' یہاں حرفِ عطف، بربنائے قرینہ دلیل ہے کہ اس کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ ہم نے تم پر اپنی محبت کا پرتو اس لیے ڈالا کہ تم سے تمھارے دشمن محبت کریں اور تمھاری پرورش خاص ہماری نگرانی میں، ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی محبت کا یہ پرتو ہی تھا جو حضرت موسیٰؑ کا محافظ بنا اور اس محافظ نے اس طرح ان کو محفوظ کر دیا کہ ان کو نہ صرف یہ کہ اپنے جانی دشمن سے کوئی خطرہ نہیں رہا بلکہ وہ دشمن ان کا گرویدہ بن گیا۔ اسی محافظِ محبت کو اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی آنکھ سے تعبیر فرمایا ہے۔ گویا اپنی محبت کا پرتو ڈال کر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر اپنی حفاظت کا پہرہ بٹھا دیا۔

إِذْ تَمْشِيٓ أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُۥ ۖ فَرَجَعْنَٰكَ إِلَىٰٓ أُمِّكَ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَٰكَ مِنَ ٱلْغَمِّ وَفَتَنَّٰكَ فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِىٓ أَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَٰمُوسَىٰ (۴۰)

اس آیت میں حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کا ایک بہت بڑا حصہ سمیٹ دیا گیا ہے۔ جن باتوں کی تذکیر اس موقع پر ضروری نہیں تھی ان کو حذف کر کے صرف چند باتوں کی طرف اجمالی اشارہ ہے اور پھر آگے سلسلۂ کلام اصل موضوع بحث سے مربوط ہو گیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے اپنی ماں کی طرف لوٹائے جانے کے لیے خدائی تدبیر

'إِذْ تَمْشِيٓ أُخْتُكَ ...... الآیۃ' یہ اس تدبیر کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے دریا میں ڈالے جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ کو ان کی ماں کی طرف لوٹائے جانے کے لیے اختیار فرمائی۔ اوپر سورۂ قصص آیت ۔ کے حوالہ سے ذکر

---

[1] تورات میں فرعون کی بیوی کے بجائے اس کی لڑکی کا ذکر آتا ہے کہ وہ اور اس کی سہیلیاں بچے کو اٹھا کر لائیں۔ قرآن نے اس کی تصحیح کر دی ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے سورۂ قصص آیت ۹ کی تفسیر ملاحظہ کیجیے۔

چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو جب یہ ہدایت فرمائی کہ بچہ کو دریا میں ڈال دو تو ساتھ ہی یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ ہم بچے کو پھر تمھارے پاس واپس لائیں گے۔ یہ وعدہ جس شکل میں پورا ہوا یہاں اس کی طرف سرسری اشارہ ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ قصص کی آیات ۹-۱۳ میں یوں آئی ہے کہ جب فرعون کی بیوی نے بچے کو دیکھا تو انھوں نے فرعون سے کہا کہ بڑا موہنا بچہ ہے۔ اس کو قتل نہ ہونے دو۔ یہ میری اور تمھاری دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ ہمارے کام آئے گا یا ہم اس کو لے پالک بنا لیں گے۔ ادھر والدۂ حضرت موسیٰؑ کا یہ حال تھا کہ انھوں نے بچے کو ایمائے خداوندی سے دریا میں ڈال تو دیا لیکن غم سے کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ انھوں نے حضرت موسیٰؑ کی بہن سے کہا کہ وہ دیکھتی رہیں کہ صندوق کدھر بہہ کے جاتا ہے۔ وہ لوگوں کی نظر بچا کر اس کو دیکھتی رہیں۔ بالآخر ان کو معلوم ہو گیا کہ صندوق فرعون کے محل کے پاس پہنچا اور وہاں دریا نے اس کو کنارے پر ڈال دیا اور فرعون اور اس کی بیوی نے بچہ کو اٹھا لیا۔ حضرت موسیٰؑ کی بہن فرعون کے محل میں پہنچیں۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ بچے کو کسی دایہ کا دودھ پلانے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن بچہ مچلا ہوا ہے، وہ کسی کی چھاتی منہ ہی سے نہیں لگاتا۔ حضرت موسیٰؑ کی بہن نے فرعون کی بیوی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر آپ لوگ کہیں تو میں ایک ایسے گھر والوں کا پتہ دے سکتی ہوں جو اس بچے کی نہایت اچھی طرح دیکھ بھال کریں گے اور بچے کو مانوس کر لیں گے۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ کے دودھ نہ پینے کے سبب سے فرعون اور اس کے گھر والوں کو نہایت پریشانی تھی اس وجہ سے یہ تجویز مان لی گئی اور اس طرح حضرت موسیٰؑ پھر اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ گئے۔

تورات میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے۔

> "تب اس کی بہن نے فرعون کی بیٹی کو کہا کہ کہیے تو میں جا کے عبرانی عورتوں میں سے ایک دائی تجھ پاس لے آؤں تاکہ وہ تیرے لیے اس لڑکے کو دودھ پلائے۔ فرعون کی بیٹی نے اسے کہا کہ جا۔ وہ چھوکری گئی اور لڑکے کی ماں کو بلایا۔ فرعون کی بیٹی نے اس سے کہا کہ اس لڑکے کو لے اور اسے میرے لیے دودھ پلا، میں تجھے اجرت دوں گی۔ اس عورت نے لڑکے کو لیا اور دودھ پلایا۔" خروج ۲: ۷-۹

تورات اور قرآن کے بیان میں جو فرق ہے اس پر تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر ذی فہم آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن کا بیان ہر اعتبار سے قرینِ عقل و فطرت ہے۔ افسوس ہے کہ تورات والے اپنے گھر کی باتوں سے بالکل بے خبر ہیں۔

یہاں اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُکَ فَتَقُوْلُ میں صیغے مضارع کے استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی بہن کو بار بار فرعون کی بیوی کو مطمئن کرنے کے لیے ان کے پاس آنا جانا پڑا تب وہ اپنی تجویز پر ان کو راضی کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ اس طرح حضرت موسیٰؑ دوبارہ اپنی ماں کے پاس پہنچے اور ماں کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ میں نے ترجمہ میں مضارع کے مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور عربیت کے اس قاعدہ کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ اگر اردو میں مدعا ٹھیک ادا نہ ہوا ہو

تو اس کو میرے تعلم کی کوتاہی پر محمول کیجیے۔

وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۗ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۔

قبطی کے قتل کا واقعہ

دریا سے نکالے جانے کے بعد سے لے کر عہدِ جوانی تک حضرت موسیٰؑ نے جن حالات میں زندگی گزاری ان میں سے یہاں صرف قبطی کے قتل اور ان کے مدین جانے کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اشارہ بھی اسی مقصد کے لیے ہے جس مقصد سے اوپر والے واقعہ کی یاددہانی کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اطمینان ہو جائے کہ جس رب نے ان کی ایسے خطرناک اور نامساعد حالات میں مدد اور رہنمائی فرمائی ہے وہ آگے کے مراحل میں بھی مدد اور رہنمائی فرمائے گا۔ یہاں چونکہ واقعات کی طرف صرف اجمالی اشارہ ہے اس وجہ سے ہم سورۂ قصص کی روشنی میں ان کی تفصیل کیے دیتے ہیں۔ یہ تفصیل ہم اپنے الفاظ میں کریں گے۔ آیات کی وضاحت اور ان کی مشکلات کی تحقیق انشاء اللہ اپنے محل میں آئے گی۔ قصص کی آیات ۱۴-۲۹ سامنے رکھ لیجیے۔ ان کی روشنی میں صورتِ واقعہ یوں سامنے آتی ہے۔

ان آیات کے اجمال کی وضاحت سورۂ قصص کی روشنی میں

حضرت موسیٰؑ جب جوان ہوئے اور ان کو عقل و علم کی روشنی حاصل ہوئی تو ان کو اپنی قوم کی ذلت و مظلومیت کا نہایت شدت کے ساتھ احساس ہوا۔ بنی اسرائیل کی حیثیت مصر میں غلاموں کی تھی اس وجہ سے ان کی بستی بھی اصل شہر سے الگ بسائی گئی تھی۔ اسرائیلی صرف خدمت اور بیگار کے لیے شہر جاتے اور وہاں اپنے قبطی آقاؤں کے ہاتھوں بری طرح پٹتے اور ذلیل ہوتے۔ حضرت موسیٰؑ کی غیرت ان مناظر کو دیکھ کر جوش میں آجاتی اور بسا اوقات اپنے مظلوم ہم قوموں کی حمایت میں وہ سینہ سپر ہو جاتے۔ فرعونیوں کو اندیشہ ہوا کہ اگر اسرائیلیوں کو ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی لیڈر مل گیا تو وہ دلیر ہو جائیں گے اور پھر ان کی آقائی خطرے میں پڑ جائے گی اس وجہ سے وہ حضرت موسیٰؑ کے دشمن ہو گئے اور غالباً حکومت نے ان کا داخلہ بھی شہر میں بند کر دیا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ دشمنوں کی نظر بچا کر اپنے ہم قوموں کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے شہر میں جاتے۔ ایک دن اسی طرح نظر بچا کر وہ شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک اسرائیلی اور ایک قبطی آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰؑ سے فریاد کی۔ حضرت موسیٰؑ کی غیرت کو جوش آگیا۔ انھوں نے اسرائیلی کی مدد کرنی چاہی تو قبطی ان سے الجھ پڑا۔ حضرت موسیٰؑ آدمی تگڑے تھے۔ انھوں نے جو ایک گھونسا رسید کیا تو وہ کہیں بے ڈھب پڑا اور قبطی وہیں ڈھیر ہو کے رہ گیا۔

حضرت موسیٰؑ کو اس حادثہ کا بڑا غم ہوا کہ بلا قصد ان کے ہاتھوں ایک ایسا جرم صادر ہو گیا جس پر وہ عند اللہ مسئول ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے بہت استغفار کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی غلطی معاف کر دی۔ اللہ تعالیٰ کے اس انعام پر انھوں نے عہد کیا کہ آئندہ میں کبھی مجرموں کا حمایتی نہیں بنوں گا۔ دوسرے دن پھر نظر بچا کر شہر پہنچے تو دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو کل طالبِ مدد ہوا تھا آج پھر ایک قبطی سے لڑ رہا ہے۔ اس نے حضرت موسیٰؑ کو دیکھا تو ان سے مدد کا طالب ہوا لیکن حضرت موسیٰؑ نے اس کو جھڑک دیا کہ تم ایک شریر آدمی معلوم

ہوتے ہوا تاہم وہ بڑھے کہ قبطی کو پکڑیں اور دونوں میں بیچ بچاؤ کرا دیں۔ اسرائیلی یہ سمجھا کہ آج وہ اسے غلطی پر سمجھ کر پکڑنا چاہتے ہیں۔ وہ ڈرا کہیں آج حضرت موسیٰ کا گھونسا اس پر نہ پڑ جائے ورنہ اس کی جان کی بھی خیر نہیں ہے۔ وہ چلایا کہ موسیٰؑ! کل تم نے ایک جان لی ہے، کیا آج میری جان بھی لینے کا ارادہ ہے! اگر تم نے یہ روش اختیار کی ہے تو یہ تو کسی مصلح کی روش نہیں ہوئی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ تم ملک میں ایک ڈکٹیٹر بننے کا ارادہ رکھتے ہو۔[1]

اس سے حضرت موسیٰؑ کو یہ اندازہ ہوگیا کہ قبطی کے قتل کا واقعہ راز نہیں رہا ہے۔ پھر مزید براں یہ ہوا کہ اکنافِ شہر سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا اور اس نے حضرت موسیٰؑ کو یہ خبر دی کہ اعیانِ حکومت آپ کے قتل کے منصوبے بنا رہے ہیں تو میرا خیر خواہانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ یہاں سے نکل جائیں۔

حضرت موسیٰؑ نے اس وقت ظالموں کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا فرمائی اور خدا کی رہنمائی و کارسازی کے بھروسہ پر مدین کا رخ کیا۔ مدین کے ایک چشمے پر کچھ دیر کے لیے ٹھہرے تو دیکھا کہ کچھ چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں لیکن دو عورتیں اپنے گلے کو روکے ہوئے کھڑی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے اندر جذبۂ فتوت ابھرا اور انھوں نے ان سے پوچھا کہ آخر تم کیوں اپنے گلے کو روکے ہوئے کھڑی ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے باپ بوڑھے ہیں، گلے کی چرواہی ہمیں کرنی پڑ رہی ہے اور ہم اس ریل پیل میں اپنے گلے کو پانی نہیں پلا سکتیں اس وجہ سے ہمیں دوسرے چرواہوں کے فارغ ہونے تک اپنی باری کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ان کی یہ بات سن کر حضرت موسیٰؑ کے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی۔ وہ اٹھے۔ ان کے گلے کو پانی پلایا اور پھر آ کر ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے اور یہ دعا کی کہ اے رب اس وقت تو مجھ پر اپنی جو رحمت نازل فرمائے، میں اس کا محتاج ہوں!

یہ دونوں صاحب زادیاں حضرت شعیبؑ کی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد ایک صاحب زادی شرماتی ہوئی حضرت موسیٰؑ کے پاس آئیں اور فرمایا کہ آپ کو ہمارے والد بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے گلے کو جو پانی پلایا ہے اس کا معاوضہ دیں۔ حضرت موسیٰؑ حضرت شعیبؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو اپنی ساری روداد سنائی۔ حضرت شعیبؑ نے ان کو تسلی دی کہ بس اب کوئی فکر نہ کرو، اللہ نے تم کو ظالموں سے نجات بخشی۔

حضرت شعیبؑ کی ایک صاحبزادی نے باپ سے سفارش کی کہ آپ ان کو اپنی خدمت میں لگا لیجیے، یہ ایک قوی اور امانت دار آدمی نظر آتے ہیں، امید ہے کہ نہایت بہتر خدمت کرنے والے ثابت ہوں گے۔

حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ میں اپنی ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے

---

[1] اس سوال پر انشاء اللہ ہم سورۂ قصص میں بحث کریں گے کہ یہ بات قبطی نے کہی یا اسرائیلی ہی اپنی حماقت کے سبب سے کہہ بیٹھا۔ یہاں مقصود صرف واقعہ کو سادہ طریقہ پر پیش کر دینا ہے تاکہ آیت زیر بحث کے مضمرات روشنی میں آجائیں۔

ساتھ اس شرط پر کر دینا چاہتا ہوں کہ تم آٹھ سال میری خدمت کرو اور اگر تم نے دس سال پورے کر دیے تو اس کا انحصار تمہاری مرضی پر ہے۔ اس معاملے میں تم پر میں کوئی دباؤ نہیں ڈالوں گا اور انشاء اللہ تم مجھے ایک بہتر آدمی پاؤ گے۔

حضرت موسیٰ نے یہ بات منظور کرلی اور فرمایا کہ یہ معاہدہ میرے اور آپ کے درمیان طے ہے۔ یہ میری مرضی پر ہے کہ میں آٹھ سال آپ کی خدمت کروں یا دس سال۔ اس معاملے میں مجھ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔ اس معاہدے پر ہم دونوں اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں۔

معاہدہ کی یہ مدت پوری کر کے جب حضرت موسیٰ مصر کے لیے واپس ہوئے تب طور کی وادیٔ ایمن میں ان کو وہ تجلی نظر آئی جس کو دیکھ کر وہ آگ لینے گئے اور نبوت لے کر لوٹے۔

سورۂ قصص کی یہ ساری تفصیل اس لیے ہم نے پیش کی ہے کہ سورۂ طٰہٰ کی زیر بحث آیت میں یہ پوری تفصیل سمیٹ دی گئی ہے۔ جب تک یہ تفصیل سامنے نہ ہو آیت کا پورا مالہٗ وما علیہ سامنے نہیں آتا۔ اب آیت کے اجزا پر غور کیجیے۔

حضرت موسیٰ کے غم اور ان کی لغزش کی نوعیت

وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ۔ مصری کے قتل کا واقعہ جن حالات میں پیش آیا ہے وہ اوپر کی تشریحات سے واضح ہو چکے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ قتل کا ارادہ رکھتے تھے اور نہ مظلوم کی حمایت کے سوا ان کے اندر کوئی اور جذبہ تھا۔ یہ جذبہ ایک نہایت محمود اور اعلیٰ جذبہ ہے جو ہر اس شخص کے اندر ہوتا ہے جو قوت و شرافت اور حمیت و غیرت سے خالی نہیں ہے۔ اس وجہ سے حضرت موسیٰ نے جو کچھ کیا وہ بجائے خود حق تھا۔ لیکن قضائے الٰہی سے ان کا گھونسا کچھ ایسا بے ڈھب پڑا کہ مصری اس کی تاب نہ لا سکا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حضرت موسیٰ کو خیال ہوا کہ یہ فعل بلا ارادہ سہی لیکن ان سے ایسا کام صادر ہو گیا ہے جس پر عند اللہ ان سے مواخذہ ہو سکتا ہے۔ اس تصور نے ان کو ایک شدید غم میں مبتلا کر دیا۔ جن کے اندر خدا کا خوف ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو الاؤنس دینے میں بہت فیاض نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنا احتساب ان چیزوں پر بھی کرتے ہیں جن کے لیے وہ چاہیں تو آسانی سے عذر تلاش کر سکتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کسی بے جا قومی عصبیت میں بھی مبتلا نہیں تھے اس وجہ سے انھیں یہ غم بھی ہوا ہو گا کہ ممکن ہے جس کی حمیت و حمایت میں ان سے یہ فعل صادر ہوا، زیادتی اسی کی رہی ہو۔ چنانچہ اوپر کی تفصیلات میں آپ نے دیکھا کہ جب دوسرے دن اسی اسرائیلی کو ایک دوسرے مصری سے انھوں نے لڑتے دیکھا اور وہ پھر ان سے طالب مدد ہوا تو انھوں نے اس کو جھڑک دیا کہ تم ایک شریر آدمی ہو۔ اگر حضرت موسیٰ کے اندر قوم پرستی کا پندار ہوتا تو غم تو درکنار ان کو فخر ہوتا کہ اپنی قوم کی حمایت میں انھوں نے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ لیکن یہ چیز بھی نہیں تھی جو ان کے لیے وجہ تسلی بن سکے اس وجہ سے انھیں اس حادثہ کا غم ہوا اور انھوں نے اپنے رب سے معافی مانگی۔ اللہ نے ان کو معاف فرمایا اور اس معافی نے ان کو اس غم سے نجات دی۔

ہمارے نزدیک اس غم میں حکومت کے انتقام کے خوف کو اگر کوئی دخل رہا ہوگا تو صرف اس پہلو سے رہا ہوگا کہ حکومت ایک نہایت ظالم حکومت تھی جس سے کسی اسرائیلی کے لیے کسی انصاف کی توقع نہیں تھی۔ اگر کوئی عادل حکومت ہوتی تو حضرت موسٰیؑ سارا معاملہ اس کے سامنے رکھ دیتے اور اس کے فیصلہ کی پابندی کرتے لیکن فرعون جیسی ظالم حکومت کے اپنے آپ کو حوالہ کرنا بالکل خودکشی کے مترادف تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال بھی حضرت موسٰیؑ کے لیے باعثِ غم ہوئی ہوگی۔ اس غم سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے بالآخر وطن کو چھوڑا اور مدین چلے گئے۔

جہاں تک اس لغزش کے صدور کا تعلق ہے، اس کے بارے میں متعدد مقامات میں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاؑ سے، بعثت سے پہلے یا بعثت کے بعد، اگر کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ اتباعِ ہوا کی نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ وہ اتباعِ حق یا طلبِ حق کے جوش میں کبھی کبھی اس کی مطلوبہ حد سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز بجائے خود کوئی برائی نہیں ہے لیکن حضرات انبیاؑ، چونکہ حق کی کسوٹی ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح کی باتوں پر بھی گرفت فرماتا ہے تاکہ میزان بالکل درست رہے۔ حضرت موسٰیؑ کی یہ لغزش بھی فی الحقیقت ایک نیکی تھی لیکن نیکی بھی اپنے حدود سے متجاوز ہو جائے تو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بعض اوقات قابلِ گرفت بن جاتی ہے، بالخصوص حضرات انبیاؑ کے بارے میں۔

حضرت موسٰیؑ کے امتحانات

وَّفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا۔ فتن فتونا کے معنی جانچنے اور پرکھنے کے ہیں۔ سنار سونے کو کٹھالی میں ڈال کر اس کے کھوٹ کو جو الگ کرتا ہے یہ لفظ اس کے لیے بھی آتا ہے۔ یہی لفظ اللہ تعالیٰ نے ان امتحانات کے لیے استعمال کیا ہے جن میں اس نے حضرت موسٰیؑ کو ڈال کر اچھی طرح پرکھا تاکہ جس کارِ خاص کے لیے وہ ان کو منتخب فرمانا چاہتا ہے اس کے وہ پوری طرح اہل بن جائیں۔ مصر میں ان کی زندگی، جیسی پُرمحن تھی اور وہاں سے جن پُرخطر حالات میں وہ نکلے ہیں ان کا کچھ اندازہ تو اوپر کے اقتباس سے ہو ہی گیا، مدین جاکر، آٹھ یا دس سال، وہاں کے پہاڑوں اور جنگلوں میں حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائیں۔ وہاں سے نکلے تو ابھی راستہ ہی میں تھے کہ رسالت کا بارِ عظیم ان پر ڈالا گیا۔ اس کے بعد جو زہرہ گداز حالات پیش آئے وہ اعراف میں بھی آپ پڑھ آئے ہیں، اس سورہ میں بھی پڑھیں گے اور آگے قصص اور دوسری سورتوں میں بھی۔ غرض ولادت سے لے کر آخر لمحۂ زندگی تک امتحانوں ہی سے سابقہ رہا اور وہ بھی ایک سے ایک بڑھ کر!

امتحانات تربیت کا لازمہ ہیں

ان امتحانوں سے متعلق ایک حقیقت ہمیشہ مستحضر رکھیے کہ یہ انسان کی تعلیم و تربیت کا لازمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں کے ذریعہ سے انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے اس وجہ سے یہ بجائے خود بھاگنے اور گھبرانے کی چیز نہیں ہیں۔ جو شخص ان سے گھبراتا اور بھاگتا ہے وہ گویا اپنی تربیت سے گھبراتا اور بھاگتا ہے۔ ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی چیز ہے تو یہ نہیں ہے کہ امتحان پیش آیا بلکہ یہ ہے کہ اس امتحان میں وہ کہیں ناکام نہ رہ جائے۔

امتحانات کے بارے میں سنتِ الٰہی

یہ امتحانات صرف مشکلات و مصائب ہی کی راہ سے پیش نہیں آتے بلکہ انعامات و افضال کی شکل میں بھی پیش آتے ہیں۔ مصائب و مشکلات کے امتحانات میں اللہ تعالیٰ بندے کے صبر کی تربیت فرمانا چاہتا ہے اور انعامات و افضال کے امتحان میں اس کے شکر کو پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ اور اسی صبر و شکر پر تمام اعلیٰ صفاتِ انسانی کا انحصار ہے۔ انہی دونوں صفتوں کی تکمیل سے دنیا میں "نفسِ مطمئنہ" کی بادشاہی حاصل ہوتی ہے اور پھر اسی کا ثمرہ وہ ابدی بادشاہی ہے جس کو قرآن نے 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

حکمتِ قرآن کا ایک دقیق مسئلہ

حکمتِ قرآن کا ایک دقیق مسئلہ یہ بھی ہے کہ صبر اور شکر کے امتحانوں میں سے زیادہ مشکل صبر کا امتحان ہے یا شکر کا؟ اس باب میں عارفین کی رائے مختلف ہے۔ میرا اپنا رجحان، قرآن کی روشنی میں، یہ ہے کہ شکر کا امتحان زیادہ مشکل ہے۔ اس میں پاس ہونے والوں کا اوسط بہت کم ہے۔ مصائب میں حق پر ثابت قدم رہنے والے تو کچھ نکل آتے ہیں لیکن نعمت پا کر بہکنے سے محفوظ رہنے والے بہت کم نکلتے ہیں۔ 'وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ' (سبا - ۱۸) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ جتنے ہی اعلیٰ مراتب پر فائز فرمانا چاہتا ہے ان کے امتحانات بھی اتنے ہی زیادہ اور اتنے ہی سخت ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرات انبیائے کرام کو جو امتحانات پیش آئے ہیں ان کی تفصیلات پڑھیے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہم اور آپ تو ان کے برداشت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ؏

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے!

اصل ڈرنے کی چیز

ان امتحانوں کے معاملے میں اصل ڈرنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ امتحان پیش آئے یا پیش آئیں گے بلکہ ایک تو وہی چیز ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ انسان اس بات سے ڈرے کہ مبادا کسی امتحان میں وہ فیل ہو جائے اور دوسری بات، اس سے بھی زیادہ ڈرنے کی یہ ہے کہ مبادا وہ سرے سے امتحان ہی سے خارج کر دیا جائے اس لیے کہ سنتِ الٰہی یہ بھی ہے کہ جو شخص بار بار فیل ہی ہوتا رہتا ہے بسا اوقات اللہ تعالیٰ اس کو اپنے امتحان ہی سے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کو 'امہال' کہتے ہیں اور یہ سخت ترین سزا ہے جو اس دنیا میں کسی فرد یا قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کے لیے امید کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

مدین میں قیام کی مدت

'فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ'۔ یہاں اس بات کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ مدین میں کتنے سال رہے لیکن اوپر سورۂ قصص کی روشنی میں ہم نے جو تفصیلات پیش کی ہیں ان سے واضح ہے کہ اس معاہدے کے تحت، جو حضرت شعیبؑ کے ساتھ انھوں نے کیا، کم از کم آٹھ سال یا زیادہ سے زیادہ دس سال وہاں انھوں نے گزارے اور اس دوران میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کی بکریاں چرائیں۔

مرحلۂ نبوت

'ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَا مُوسَىٰ' (۴۰) اوپر کے تمام حالات و واقعات کا حوالہ دینے کے بعد ارشاد ہوا کہ یہ جو کچھ ہوا ہماری سکیم اور ہمارے مقرر کیے ہوئے پروگرام کے مطابق ہوا اور ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے ٹھیک

اس وقت پر، جو ہم نے تمہاری یہاں کی حاضری کے لیے پہلے سے مقرر کر رکھا تھا، تم یہاں پہنچے اور ہم نے تمھیں اپنی نبوت و رسالت سے مشرف کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے تمھاری ولادت سے لے کر اب تک ہر مرحلہ میں تمھاری حفاظت کی ہے اور تمھارے لیے اپنے منصوبے تمھارے اور اپنے دونوں کے دشمنوں سے پورے کرائے ہیں وہ ہر قدم پر تمھارے ساتھ ہے اور جو ذمہ داری وہ تمھارے سپرد کر رہا ہے اس کے ادا کرنے کے لیے وہ خود راہیں کھولے گا اور خود اسباب فراہم فرمائے گا۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (۴۱)

'اِصْطِنَاع' کا اصل مفہوم کسی کو کسی خاص مقصد کے لیے تربیت اور ٹریننگ دینے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے جو تمھیں اتنی بھٹیوں میں تپایا اور اتنے امتحانوں سے گزارا ہے تو اپنے ایک کارِ خاص کے لیے یہ تمھاری تربیت کی ہے اور اب وہ کارِ خاص میں تمھارے سپرد کر رہا ہوں سو تم اس ذمہ داری کو اٹھاؤ اور میرے اعتماد پر اس کی انجام دہی کے لیے آگے بڑھو۔

اِذْهَبْ أَنْتَ وَأَخُوكَ بِآيَاتِي وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي (۴۲)

یہ اس حکم کا اعادہ ہے جو آیت ۲۴ میں دیا گیا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اس کو انذار کرو۔ بیچ کی آیات حضرت موسیٰ کی تسکین و تسلی کے لیے ہیں۔ ان کی دعا کی قبولیت کی بشارت اور ان پر سابق افضال و عنایات کا حوالہ دینے کے بعد پھر ہدایت ہوئی کہ میری نشانیوں کے ساتھ بے خوف و خطر، فرعون کے پاس جاؤ۔ پہلے صرف حضرت موسیٰ کو حکم ہوا تھا لیکن اب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ دونوں کو حکم ہوا اس لیے کہ حضرت موسیٰ کی درخواست پر حضرت ہارونؑ بھی شریکِ نبوت بنا دیے گئے تھے۔

ذکر سے مراد

'وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي'۔ اسی ہدایت کی تاکید مزید ہے جو آیت ۳۴ میں دی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے ذکر میں ڈھیلے نہ پڑھنا۔ ذکر سے مراد، جیسا کہ آیت ۳۴ کے تحت ہم ذکر کر آئے ہیں، ذکرِ عبادت و ذکرِ دعوت دونوں ہی ہے۔ نبی کا ہر کام ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔ وہ جب نماز پڑھتا ہے تو اس کے ذریعے سے درحقیقت اس تذکیر کے لیے اللہ تعالیٰ سے قوت و معرفت حاصل کرتا ہے جو وہ خلق کو کرتا ہے۔ دعوتِ حق کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی سرچشمہ سے اس کو غذا اور قوت حاصل ہوتی ہے۔ اگر اس سرچشمہ سے تعلق کمزور ہو جائے تو دعوت بے جان اور بے روح ہو جاتی ہے اور اگر اس سرچشمہ سے تعلق بالکل ہی منقطع ہو جائے تو پھر وہ دعوت بالکل شیطانی دعوت بن کے رہ جاتی ہے اگرچہ اس میں نام خدا ہی کا لیا جائے۔

اِذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ (۴۳)

فرعون کے طغیان کی تفصیل آیت ۲۴ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ خطاب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ دونوں سے ہے اس وجہ سے لازماً یہ بات بعد کے مرحلہ کی ہے جب حضرت موسیٰ مصر پہنچ چکے ہیں اس لیے کہ حضرت ہارونؑ وادی طویٰ میں حضرت موسیٰ کے ساتھ نہیں تھے۔

فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی (۴۴)

انبیاء کا طریق دعوت

یہ طریق دعوت سے متعلق ہدایت ہے کہ دعوت بہر حال نرمی کے ساتھ دی جائے۔ اس ہدایت کی ضرورت صرف اس پہلو سے نہیں تھی کہ اب حضرت موسیٰؑ فرعون کے سامنے ایک بے بس اسرائیلی کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدا کے ایک سفیر کی حیثیت سے جا رہے تھے اور ہاتھ میں عصائے موسوی بھی تھا بلکہ لینیت اور نرمی دعوتِ حق کی فطرت ہے۔ حضرات انبیاء کی بعثت تعلیم و اصلاح کے لیے ہوئی اس وجہ سے ان کی دعوت اور ان کے انذار میں ایک معلم کی شفقت اور ایک غمگسار کی دل سوزی ہمیشہ نمایاں رہی ہے۔ کسی نبی کے متعلق بھی یہ بات علم میں نہیں آئی کہ اس نے ہیکڑی جتائی اور دھونس جمائی ہو۔ سخت سے سخت حالات میں بھی ان کا طرزِ خطاب اور اندازِ جواب نہایت ہی نرم، مؤثر اور ہمدردانہ رہا ہے۔ ہیکڑی جتانا اور دھونس جمانا دنیا پرست لیڈروں کی خصوصیات میں سے ہے۔ موجودہ زمانے کے شیطانی پروپیگنڈے کی تو سمجھیے ساری بنیاد ہی اسی پر ہے۔

دعوتِ انبیاء کا اصل مقصد

'لَعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی'۔ حضرات انبیاء کی دعوت و تعلیم کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ مخاطب میں 'تذکر' اور 'خشیت' پیدا ہو۔ جن کے اندر صرف غفلت ہوتی ہے وہ تو نبی کی تذکیر سے فوراً جاگ پڑتے ہیں۔ وہ گویا راستہ بھولے ہوئے ہوتے ہیں، بتانے والے نے جوں ہی ان کو بتا دیا وہ سیدھی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسرے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی گمراہی کچھ پختہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے اندر، اگر ان کے اندر قبولیتِ حق کی کچھ صلاحیت ہوتی ہے، نبی کے انذار سے خدا اور اس کی پکڑ کا کچھ خوف پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے لگتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال ہوتی ہے تو وہ ہدایت کی راہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں 'یَتَذَکَّرُ' سے پہلی حالت کی طرف اشارہ ہے اور 'یَخْشٰی' سے دوسری حالت کی طرف۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی (۴۵)

ایک اندیشہ کا اظہار

دونوں ہی حضرات نے یہ عرض کی کہ اے ہمارے رب! ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ وہ معاملہ پر غور کرنے سے پہلے ہی یا تو ہم پر ہاتھ ڈال دے گا یا یہ ہو گا کہ ہماری بات سنتے ہی، برہم ہو کر، اس ظلم و ستم میں اور اضافہ کر دے گا جو وہ اب تک بنی اسرائیل پر کرتا رہا ہے۔ 'فَرَطَ' کا صلہ جب 'عَلٰی' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی کے خلاف عاجلانہ اقدام کے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ فرعون تو پہلے ہی غصہ سے بھرا بیٹھا ہے۔ بھلا وہ ہمیں زبان کھولنے کی اجازت کب دے گا! وہ بات سننے سے پہلے ہی یا تو ہمیں ختم کر دینے کی تدبیر کرے گا یا اس کی سرکشی اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ یہاں دعا میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں شریک ہیں۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے جس کا ذکر آیت ۴۳ کے تحت ہم نے کیا ہے کہ یہ ہدایات مصر پہنچنے کے بعد دی گئی ہیں جب حضرت ہارونؑ بھی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہو گئے ہیں۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی (۴۶)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی

اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ ڈرو نہیں، میں تمھارے ساتھ ہوں اور سب کچھ سنتا دیکھتا ہوں۔ میں تمھارے ساتھ ہوں، کے اجمال کے اندر جو تفصیل مضمر ہے وہ محتاج بیان نہیں اور سنتا دیکھتا ہوں، کے الفاظ کے اندر جو سطوت و جلالت اور جو تحفظ و ضمانت ہے وہ بھی تشریح سے بالاتر ہے۔ جب اللہ ساتھ ہے اور وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے اور وہی ایک مہم پر بھیج رہا ہے تو پھر اگر ساری خدائی بھی دشمن ہو جائے تو کیا ڈر ہے!

فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۖ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ ۖ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ (۴۷)

'إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ'۔ اگرچہ رسول کی حیثیت صرف حضرت موسیٰ ہی کو حاصل تھی، حضرت ہارونؑ صرف ایک نبی تھے لیکن یہاں علیٰ سبیل التغلیب دونوں ہی حضرات کے لیے رسول کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

'فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ'۔ اس آیت کی تفسیر سورۂ اعراف کی آیات ۱۰۴ - ۱۰۵ کے تحت گزر چکی ہے[1]۔ وہاں ہم نے وضاحت کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے اور ان لوگوں کے خیال کی تردید بھی کی ہے جنھوں نے حضرت موسیٰ کی دعوت کو ایک قوم پرست لیڈر کی تحریک آزادی کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

آیت سے مراد

'قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ'۔ یہاں آیت سے مراد دلیل و حجت ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی تعداد کیا ہے۔ چنانچہ یہی مضمون سورۂ اعراف میں یوں آیا ہے 'قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ' (میں تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے ایک واضح حجت لے کر آیا ہوں) پیچھے ہم اس سوال پر بھی بحث کر آئے ہیں کہ حضرت موسیٰ کو بالکل پہلے ہی مرحلہ میں معجزات کیوں دیے گئے اور وہ کیا خاص حالات تھے جن کے سبب سے انھوں نے بالکل پہلے ہی قدم پر ان کا اظہار و اعلان بھی کر دیا۔

خیرخواہی اور تنبیہ ساتھ ساتھ

'وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ'۔ اس فقرے میں وہ خیرخواہی اور ہمدردی بھی ہے جو انبیاء کی دعوت کی خصوصیت ہے اور جس کی حضرت موسیٰ کو آیت ۴۴ میں ہدایت ہوئی اور ساتھ ہی نہایت لطیف تنبیہ بھی ہے، کہ سلامتی صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا کی ہدایت کی پیروی کریں۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک تو تم نے جو کچھ کیا وہ کیا لیکن اب جب کہ خدا کے رسولوں کے ذریعہ سے تمھارے پاس خدا کی ہدایت آچکی ہے تو سلامتی کی راہ یہی ہے کہ اس کو سیدھے سیدھے اختیار کر لو ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ (۴۸)

یہ اوپر والی آیت کے مضمر مضمون کو نہایت نرم انداز میں کھول دیا کہ ہم پر یہ وحی آئی ہے کہ جو جھٹلائے

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن ج ۲، ص ۱۷ - ۱۸۔

اور اعراض کرے گا اس کے اوپر عذاب آئے گا۔

آیت کے چند لطیف پہلو

اس آیت پر تدبر کیجیے تو کئی لطیف باتیں سامنے آئیں گی۔

ایک تو یہ کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے عام لیڈروں کی طرح فرعون پر اپنی طرف سے عذاب کی کوئی دھونس جمانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کو صرف اللہ تعالیٰ کی اس وحی کی خبر دی جوان پر آئی تھی کہ تکذیب اور اعراض کرنے والوں پر اللہ کا عذاب آجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ انھوں نے اسی لیے اختیار فرمایا کہ اپنی طرف سے فرعون کے لیے کوئی وجہ اشتعال نہ پیدا ہونے دیں۔

دوسری یہ کہ انھوں نے فرعون کو مخاطب کرکے یوں نہیں فرمایا کہ اگر تو جھٹلائے گا اور اعراض کرے گا تو تجھ پر عذاب الٰہی آدھمکے گا بلکہ بصیغۂ عام یوں فرمایا کہ جو ایسا کرے گا اس کا انجام یہ ہوگا تاکہ فرعون کے کانوں میں بات پڑ بھی جائے اور اس کی انانیت کو ٹھیس بھی نہ لگے۔

تیسری یہ کہ 'کذّب' کے مفعول اور 'تولّٰی' کے متعلق، دونوں کو یہاں حذف کر دیا۔ یوں نہیں فرمایا کہ جو ہماری رسالت کی تکذیب اور ہماری لائی ہوئی ہدایت سے اعراض کرے گا اس پر عذاب آئے گا۔ اس لیے کہ یہ بات از خود واضح تھی اور اس کے اظہار سے بھی بہر حال فرعون کے پندار کو چوٹ لگتی۔

اوپر حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کو دعوت میں نرمی کی جو تلقین فرمائی گئی تھی یہ اس کا طریقہ بھی بتا دیا گیا کہ اس طرح دعوت دینا کہ بات بھی پہنچ جائے اور تمھاری طرف سے اشتعالِ طبع کا کوئی سبب بھی پیدا نہ ہونے پائے۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى (۴۹)

فرعون کو دعوت اور اس کا معارضہ

قرینہ دلیل ہے کہ یہاں بربنائے وضاحت یہ بات حذف کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو جو پیغام دے کر فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا وہ پیغام وہ لے کر گئے اور ٹھیک ٹھیک ہدایت الٰہی کے مطابق اس کو فرعون تک انھوں نے پہنچا بھی دیا۔ یہ سن کر فرعون بولا کہ اے موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے؟ یعنی تم جو رب کے رسول بن کر آئے ہو تو آخر وہ رب کون ہے؟ رب تو میں ہوں تو آخر تم میرے دربار میں اور کس رب کے رسول بن کر آئے ہو؟ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ فرعون کی حیثیت مصر میں (INCARNATION OF GOD) اوتار بادشاہ کی سمجھی جاتی تھی۔ وہ مصریوں کے عقیدے میں ان کے سب سے بڑے دیوتا ـــ سورج ـــ کا مظہر تھا اور اسی عقیدے کے تحت اس کے اسٹیچو اور بت تمام مصر میں پوجے جاتے تھے۔

فرعون کا یہ سوال محض بطور طنز و تحقیر کے تھا ورنہ خدائی کے دعوے کے باوجود وہ اس بات سے تو ناواقف نہیں ہو سکتا تھا کہ بنی اسرائیل اس کے غلام و محکوم سہی لیکن بہر حال وہ اس کو خدا نہیں مانتے۔ لیکن اب تک بنی اسرائیل کے خدا کی حیثیت مصر میں ایک بے جان خدا کی تھی جس کا نام تو بنی اسرائیل اپنے گھروں میں شاید لیتے رہے ہوں گے لیکن زندگی کے عملی معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ عملی معاملات پر خدائی فرعون

ہو گئی تھی۔ یہ پہلی مرتبہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے خدا کو فرعون کے سامنے ایک زندہ خدا کی حیثیت سے پیش کیا اور صرف پیش ہی نہیں کیا بلکہ اس کے نام سے چند نہایت اہم مطالبات بھی اس کے سامنے رکھ دیے اور وہ بھی اس تنبیہ کے ساتھ کہ اگر سلامتی چاہتے ہو تو ہماری بات مانو ورنہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہو! ظاہر ہے کہ فرعون بنی اسرائیل کے اس زندہ خدا سے اب تک واقف نہیں تھا اس وجہ سے اس کو یہ صدا عجیب معلوم ہوئی اور اس نے تعجب اور تحقیر کے انداز میں یہ سوال کیا جو اوپر مذکور ہوا۔ تورات میں اس موقع پر جو عبارت ہے اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ خروج ۵: ۲ میں ہے۔

”فرعون نے کہا کہ خداوند کون ہے کہ میں اس کی آواز کو سنوں کر بنی اسرائیل کو جانے دوں؟ میں خداوند کو نہیں جانتا اور نہ میں بنی اسرائیل کو جانے دوں گا۔“

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۵۰)

مختصر لیکن دندان شکن جواب

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی خلقت عطا فرمائی، پھر اس کی خلقت کے اعتبار سے اس کی رہنمائی فرمائی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر شے اپنے مقصدِ وجود کے اعتبار سے ایک خاص قالب و ہیئت رکھتی ہے اور پھر اس مقصدِ وجود کی تحصیل و تکمیل کے لیے اپنے اندر ایک جبلی رہنمائی بھی رکھتی ہے۔ شہد کی مکھی کو جس مقصد کے لیے خالق نے پیدا کیا ہے اس کی تکمیل کے لیے اس کے ننھے سے وجود کے اندر اس نے وہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں جو اس کے لیے ضروری ہیں اور پھر اس کی جبلت کو یہ الہام بھی فرما دیا کہ وہ کس طرح اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرے اور اپنے لیے شہد کا ذخیرہ فراہم کرے۔ یہی حال اس کائنات کی ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کا ہے۔ ایک چیونٹی، ایک جھینگا، ایک مکڑی، ایک بکری، ایک شیر سب کو قدرت کی طرف سے ایک خاص نوع کی خلقت اور اس کی ضرورت کے اعتبار سے ایک جبلی ہدایت عطا ہوئی ہے۔ سب کو خدا نے الہام فرمایا ہے کہ کس طرح اور کس نوع کی اپنے لیے غذا حاصل کریں، کس طرح توالد و تناسل کا سلسلہ قائم کریں، کس طرح اپنی اور اپنی نسل کی حفاظت کریں، کس چیز سے بچیں، اور کس چیز کو اختیار کریں اور پھر کس طرح اس کائنات کی مجموعی خدمت میں اپنا فریضہ ادا کریں۔

بلبل کی نغمہ سنجی، طوطی کی شکر فشانی اور کوئل کی کوک کس کا الہام ہے؟ ظاہر ہے کہ ان کے خالق ہی کا! تو وہی خالق ان کا اور سب کا رب بھی ہے!

ہر شے پر ہدایت کا فیضان

صرف جاندار چیزوں ہی تک قدرت کا یہ فیض محدود نہیں ہے بلکہ چمن کے بیل بوٹے جو ثمر باری اور گل ریزی کرتے ہیں، سوسن، بنفشہ، گلاب اور سرو و صنوبر جو چمن آرائی کرتے ہیں، سیب، انار اور انگور جو دعوتِ شوق دیتے ہیں، آخر یہ کس کی بخشی ہوئی خلقت اور یہ کس کی عطا کردہ جبلت ہے؟ آخر کون ہے جو ان میں سے کسی ایک چیز کے بھی خلق کا دعویٰ کر سکے یا یہ کہہ سکے کہ یہ اس کا کرشمہ ہے کہ اس نے سیب کے اندر سیب کی خاصیت ودیعت کی اور کیکر کے اندر کیکر کی۔ چمن کے ہر پودے، میدان کی ہر گھاس اور جنگل کی ہر جھاڑی

میں یہ الگ الگ مزاج، الگ الگ رنگ و بو اور الگ الگ فوائد و نقصانات کون ودیعت کرتا ہے؟ جو کرتا ہے وہی رب ہے، نہ کہ ہر خرِ نا شخص جو سر پر تاج اوڑھ لے اور خدائی کا دعوے دار بن بیٹھے وہ رب بن جاتے۔

زمین ہی نہیں ایک نظر آسمان پر بھی ڈال لیجیے۔ یہ سورج، یہ چاند، یہ کہکشاں، یہ قوسِ قزح، یہ آسمان، یہ ابر، یہ ہوا، آخر کس نے ان کو پیدا کیا اور کون ہے جس نے ان کے فرائض ان کو الہام کیے؟ جس نے ان کو پیدا کیا اور ان کو ان کے فرائض الہام کیے وہی رب ہے! سورج کا اوتار بن کر تخت پر براجمان ہو جانا تو بہت آسان ہے لیکن کون ہے جو ایک منٹ کے لیے سورج کو اس کے وقت سے پہلے نمودار کر سکے یا افق سے اس کو غائب کر سکے!

اس کائنات میں اشرف المخلوقات کی حیثیت انسان کو حاصل ہے۔ اس کو قدرت نے بہترین خلقت بھی عطا فرمائی ہے اور نہایت اعلیٰ صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے لیکن نہ کسی کو اپنی خلقت کے معاملہ میں کوئی دخل ہے نہ اپنی صلاحیتوں کی تخلیق ہی میں کسی کا کوئی حصہ ہے۔ یہ خدا ہی ہے جس نے ہمیں ہاتھ، پاؤں، ناک، کان اور آنکھ کی قوتیں دیں اور اسی نے ہمیں جبلت و فطرت اور عقل و ادراک و شعور کی نعمتیں بخشیں۔ یہ انہی چیزوں کا فیض ہے کہ آج خشکی و تری، دریا اور پہاڑ سب ہمارے لیے یکساں ہیں۔ ہم سمندروں کا سینہ چیرتے اور فضاؤں میں اڑتے ہیں۔ ہماری رسائی زمین کے بعید ترین گوشوں اور کونوں ہی تک نہیں بلکہ چاند و مریخ تک ہے۔ بجلی اور ایٹم سب پر ہمارا تصرف ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی یہ مغالطہ نہ ہو کہ یہ آپ کی اپنی پیدا کردہ صلاحیتوں کا کرشمہ ہے! جو اس مغالطہ میں ہے وہ احمق ہے! یہ سب خدا کی بخشی ہوئی عقل کا کرشمہ ہے جس کی بدولت انسان قدرت کے کچھ قوانین دریافت کر کے چاند اور مریخ پر تاخت کرتا پھر رہا ہے۔ اگر یہ خدا کی بخشی ہوئی عقل کی رہنمائی سے اس کے کچھ قوانین دریافت کر لے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت پیدا کر لے تو اس پر اتنا مغرور نہ ہو جائے کہ خدا کی خدائی ہی کو چیلنج کر دے۔

حضرت موسیٰؑ نے جواب تو نہایت مختصر الفاظ میں دیا لیکن اس کے اندر تفصیل نہایت طویل مضمر ہے۔ اور اگرچہ الفاظ نہایت نرم ہیں لیکن جواب نہایت دندان شکن ہے۔ انھوں نے نہایت جامع الفاظ میں فرعون پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ رب ہونے کا حق دار تو وہی ہو سکتا ہے جس نے خلق کیا اور ہدایت بخشی، تمھارا حصہ نہ خلق میں نہ ہدایت میں تو تم رب ہونے کے مدعی کس طرح بن بیٹھے! یہی حقیقت دوسرے الفاظ میں یوں بیان ہوئی ہے۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى (اپنے اس خدائے برتر کی تسبیح کرو جس نے خاکہ بنایا پھر اس کے نوک پلک درست کیے، اور جس نے صلاحیتیں ودیعت کیں پھر ان کے استعمال کا طریقہ بتایا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان پر خدا کی حجت قائم کر دینے کے لیے تو اس کی فطرت اور عقل کی رہنمائی ہی کافی

ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں اور اپنی کتابوں اور صحیفوں کے ذریعہ سے بھی انسان کی ہدایت کا انتظام کیا۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (القیٰمۃ: ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان اپنے اوپر خود گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذر تراشے)

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی (۵۱)

فرعون کا استہزاء

فرعون نے حضرت موسیٰ کی اس تذکیر پر سنجیدہ طریقہ سے غور کرنے کے بجائے باندازِ طنز و تحقیر یہ سوال کیا کہ اچھا، اگر رب کے پاس سے آئے ہو تو ذرا پچھلی قوموں کا حال سناؤ کہ ان کا کیا بنا اور وہ کس حال میں ہیں! مطلب یہ کہ جب وہاں سے آرہے ہو تو وہاں کے سارے احوال سے تم تو واقف ہی ہوگے ذرا ہمیں بھی تو وہاں کا احوال سناؤ! یہ ملحوظ رہے کہ برخود غلط اور متکبر لوگ اسی قسم کے غیر متعلق سوال چھیڑ کر سنجیدہ باتوں کو بے اثر بنانے اور اپنے اندھے بہرے معتقدین میں اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی (۵۲)

پُروقار جواب اور تذکیر

فرعون کا سوال اگرچہ غیر متعلق بھی تھا اور تحقیر آمیز بھی لیکن حضرت موسیٰ نے نہ صرف جواب پُروقار و سنجیدہ دیا بلکہ تذکیر و تنبیہ کا ایک اور نہایت پر حکمت درس بھی اس کو سنا دیا۔ فرمایا کہ ان قوموں کا سارا ریکارڈ میرے رب کے پاس ایک عظیم دفتر میں محفوظ ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ لفظ 'کتاب' کی تنکیر یہاں تفخیم شان پر دلیل ہے۔ یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ کوئی ایسی ویسی کتاب ہے بلکہ اس میں ایک ایک جزئیہ قلمبند ہے۔ جب یہ کھلے گی تو سب پکار اٹھیں گے کہ مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا كَبِیْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا (عجیب ہے یہ کتاب کہ کوئی چھوٹی یا بڑی بات ایسی نہیں رہ گئی ہے جس کو اس نے محفوظ نہ کر لیا ہو)

'لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی' یعنی میرے رب کا علم خطا اور نسیان سے بالکل پاک ہے نہ وہ کوئی غلطی کرتا ہے نہ کسی چیز کو بھولتا ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی چیز اس کے علم میں آنے سے رہ جائے یا آئے تو غلط شکل میں آئے اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ علم میں آئی ہوئی کسی چیز کو بھول جائے۔ غور کیجیے، حضرت موسیٰ اس غیر متعلق اور طنزیہ سوال کا یہ جواب بھی دے سکتے تھے کہ مجھ سے کوئی فضول سوال نہ کرو۔ میں خدا کا رسول بن کر آیا ہوں، میں نے غیب دانی کا دعویٰ نہیں کیا ہے اور نہ یہ کہا ہے کہ تمام پچھلی قوموں کا ریکارڈ میرے پاس ہے۔ لیکن انھوں نے یہ جواب دینے کے بجائے نہایت بلیغ انداز میں اس کو یہ تنبیہ کی کہ ہرچند میں تو سارے غیب کا عالم نہیں لیکن میرا رب ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور اس کا علم ہر خطا و نسیان سے پاک ہے۔ اس کے پاس سارا ریکارڈ محفوظ ہے۔ جو قومیں صفحۂ ارض سے مٹ چکی ہیں ان کی نسبت بھی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اب وہ افسانۂ ماضی ہو چکی ہیں بلکہ سب کے نامۂ اعمال خدا کے بے خطا رجسٹر میں مرقوم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ایک چیز محفوظ ہے تو یہ صرف محفوظ رکھنے کے لیے تو محفوظ نہیں ہے بلکہ حساب و کتاب اور جزا و سزا کے لیے محفوظ ہے۔ یہ بات چونکہ بالکل ظاہر تھی اس وجہ سے حضرت موسیٰ

نے اس کا اظہار نہیں فرمایا لیکن ان کا اندازِ کلام خود اس کو نہایت خوبی کے ساتھ ظاہر کر رہا ہے۔ بعض مواقع میں کنایہ جتنا مؤثر ہوتا ہے صراحت اتنی مؤثر نہیں ہوتی۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَھْدًا وَّسَلَکَ لَکُمْ فِیْھَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ط فَاَخْرَجْنَا بِہٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ہ کُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَکُمْ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّھٰی ہ مِنْھَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْھَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْھَا نُخْرِجُکُمْ تَارَۃً اُخْرٰی ہ وَلَقَدْ اَرَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا کُلَّھَا فَکَذَّبَ وَاَبٰی (۵۳-۵۶)

ایک تضمین

قرینہ دلیل ہے کہ یہ چار آیتیں حضرت موسیٰؑ کے کلام کا حصہ نہیں ہیں بلکہ بطور تضمین، براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اس قسم کی تضمین کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کلام صرف ماضی کی ایک حکایت نہیں رہتا بلکہ وہ حال پر پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو جو جواب دیا اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ اپنی بات ملا کر قریش کے فراعنہ کو بھی سنا دی کہ یہ صرف ماضی کی حکایت نہیں ہے بلکہ تمھاری بھی حکایت ہے۔ تم بھی سن لو کہ کون تمھارا رب ہے اور کون تمھاری عبادت و اطاعت کا اصلی حقدار ہے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَھْدًا وَّسَلَکَ لَکُمْ فِیْھَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِہٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ہ کُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّھٰی۔

خدا کے رب ہونے کی دلیل اس کی ربوبیت کے پہلو سے

یہ خدا کے رب ہونے کی دلیل اس کی ربوبیت کے پہلو سے ہے یعنی جس ذات نے تمھارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا، اس کے اندر فلک بوس پہاڑ بنائے، تو ان کے اندر تمھارے گزرنے کے لیے درے اور دروازے بھی بنا دیے۔ آسمان سے پانی برسایا اور اس سے قسم قسم کی نباتات اور طرح طرح کے درخت اگا دیے جن میں سے ہر چیز زبانِ حال سے دعوت دے رہی ہے کہ خود بھی کھاؤ برتو اور اپنے چوپایوں کو بھی چراؤ چگاؤ۔ درحقیقت وہی ذات اس بات کی سزاوار ہے کہ اس کو رب مانو۔ فرمایا کہ پروردگاری کے اس اہتمام و انتظام کے اندر اہل عقل کے لیے بہت سی دلیلیں ہیں۔ یہاں ان دلیلوں کی وضاحت نہیں فرمائی ہے لیکن اس نظامِ ربوبیت کے اندر اس کے خالق کی قدرت، حکمت، رحمت کی جو دلیلیں ہیں وہ ان لوگوں سے مخفی نہیں ہو سکتیں جن کے اندر عقل ہے اور وہ اپنی عقل سے کام بھی لیتے ہیں۔ یہ نظامِ ربوبیت خدا کی توحید پر بھی شاہد ہے اور ایک روزِ جزا و سزا کی آمد پر بھی۔ ان دلائل کی وضاحت اس کتاب میں پیچھے بھی جگہ جگہ ہو چکی ہے اور آگے بھی آئے گی۔ یہاں مقصود صرف اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ رب مانے جانے کی حقدار تو وہی ذات ہو سکتی ہے جس نے پرورش کے یہ سارے سامان مہیا کیے ہیں۔ جب ان چیزوں کے مہیا کرنے میں کسی کو کوئی دخل نہیں ہے تو کوئی دوسرا رب ہونے کا حق دار کس طرح ہو سکتا ہے!

مِنْھَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْھَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْھَا نُخْرِجُکُمْ تَارَۃً اُخْرٰی۔

ربوبیت سے معاد پر استدلال

یہ اسی ربوبیت سے قیامت پر استدلال فرمایا ہے کہ ہم نے اسی زمین سے تمھیں پیدا کیا ہے اور پھر مرنے

کے بعد اسی میں تمھیں لوٹاتے ہیں اور پھر اسی سے تمھیں دوبارہ نکالیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس تمام اہتمام ربوبیت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں اس کائنات کے رب کا عدل ظہور میں آئے۔ جنھوں نے خدا کی نعمتوں کا حق ادا کیا ہو وہ اس کا صلہ پائیں اور جنھوں نے ان نعمتوں کو خدا کی زمین میں فساد کا ذریعہ بنایا ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔ فرمایا کہ یہ دوبارہ پیدا کر دینا ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں۔ جب ہم نے اسی سرزمین سے تم کو پیدا کیا اور ہمیں اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو پھر اسی سے دوبارہ پیدا کرنے میں کیوں مشکل پیش آئے گی جب کہ ہم تمھیں، تمھارے مرجانے کے بعد، اسی میں واپس بھی کر رہے ہیں!

وَلَقَدْ اَرَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا کُلَّہَا فَکَذَّبَ وَاَبٰی ۵۶

یعنی ہم نے فرعون کو اپنی ہر قسم کی نشانیاں دکھائیں لیکن وہ اس کے باوجود ہمارے رسولوں کی تکذیب پر اڑا ہی رہا اور ہماری ہدایت قبول کرنے سے انکار ہی کرتا رہا۔ یہاں نشانیوں سے مراد وہ تمام نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ کی دعوت کے بعد مصر میں یکے بعد دیگرے، فرعون کو متنبہ کرنے کے لیے ظاہر ہوئیں لیکن فرعون آخر وقت تک اپنی ضد پر اڑا ہی رہا۔ ان نشانیوں کی تفصیل تورات میں موجود ہے۔ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم نے ان کا حوالہ دیا ہے۔

ان آیتوں پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ متکلم کے صیغے استعمال فرمائے۔ اس وجہ سے یہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، حضرت موسیٰ کے کلام کا حصہ نہیں ہیں بلکہ تضمین ہیں۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ یٰمُوْسٰی ۵۷

فرعون کی ایک سیاسی چال

سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ اس دور میں فرعون اور اس کے ارکان حکومت کو بنی اسرائیل سے سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ ان کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ طاقتور ہو کر بیرونی دشمنوں کے آلۂ کار بن جائیں اور ایک دن فرعون اور اس کی قوم کو ملک سے بے دخل کر دیں۔ اسی خطرے کو پیش نظر رکھ کر اسرائیلی بچوں کے قتل کی مہم چلائی گئی لیکن یہ مہم ناکام رہی۔ بنی اسرائیل کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ البتہ بنی اسرائیل کے اندر اس وقت تک کوئی ایسا لیڈر نہیں تھا جو ان کو منظم کر سکے۔ حضرت موسیٰ سے فرعون کو، جیسا کہ ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں، ان کے مدین جانے سے پہلے بھی خطرہ تھا کہ وہ اپنی قوم کو بیدار کر رہے ہیں۔ وہ بنی اسرائیل کے مظلوموں کی حمایت و مدافعت میں ہمیشہ سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ چنانچہ اسی جرم میں ان کا داخلہ بھی شہر میں بند تھا اور بالآخر ایک قبطی کے قتل کے سبب سے انھیں مدین چلے جانا پڑا۔ اب جب وہ آئے اور اس شان کے ساتھ آئے کہ انھوں نے فرعون کے سامنے چند نہایت اہم مطالبات بھی نہایت دبدبہ کے ساتھ، رکھ دیے تو اس نے تاڑ لیا کہ اس کو جو خطرہ تھا اب وہ ایک حقیقت کی شکل میں سامنے آگیا ہے۔ چنانچہ اس نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ اے موسیٰ کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ اپنے اس جادو کے زور سے ہمیں ہمارے ملک سے بے دخل کر دو! —— فرعون ایک نہایت گھاگ سیاسی تھا۔ اس نے ایک تو حضرت موسیٰ

کی اس دعوت کو ایک سیاسی خطرہ کا رنگ دے کر اپنی قوم کو مشتعل کرنے کی کوشش کی، دوسرے ان کے معجزات کو سحر سے تعبیر کر کے اس اثر کو مٹانے کی کوشش کی جو لوگوں پر ان کا پڑا ہوگا۔

فَلَنَاْتِیَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَیْنَنَا وَبَیْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى (۵۸)

'مَوْعِد' ظرف زمان اور ظرف مکان، یعنی وقت موعود اور مقام موعود، دونوں معنوں میں آتا ہے۔ اس آیت میں یہ دونوں معنوں کو محتمل ہے اور بعد والی آیت میں ظرف زمان کے معنی میں ہے۔ اس قسم کے ظرف کی بعض مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں۔

'سُوًی' کے معنی 'وسط' کے ہیں۔ 'مَكَانًا سُوًى' یعنی ایسی جگہ ہو جو ہمارے اور تمھارے دونوں کے لیے یکساں ہو۔ جہاں ہمارے آدمی بھی آسانی سے جمع ہو سکیں اور تمھارے آدمی بھی۔

فرعون نے حضرت موسیٰ کو جواب دیا کہ اگر تم جادو کے بل پر ہمیں ہمارے ملک سے بے دخل کرنے اٹھے ہو تو ہمارے پاس جادو کی کمی نہیں ہے، ہم بھی ایسا ہی جادو دکھا سکتے ہیں تو تم ہمارے اور اپنے درمیان مقابلہ کے لیے کوئی ایسی جگہ متعین کرو جو فریقین کے لیے یکساں ہو اور دونوں طرف کے لوگ ایک معین وقت پر اس جگہ جمع ہوں، نہ تم اس کی خلاف ورزی کرو اور نہ ہم ـــــ فرعون کی اسکیم یہ تھی کہ مقابلہ کھلے میدان میں پوری پبلک کے سامنے ہو تاکہ سب کے سامنے حضرت موسیٰ کو شکست دے کر پہلے ہی مرحلہ میں ان کے قدم اس طرح اکھاڑ دیے جائیں کہ پھر وہ سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ یَوْمُ الزِّیْنَةِ وَاَنْ یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى (۵۹)

فرعون کے چیلنج کا جواب

حضرت موسیٰ کو چونکہ اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا اس وجہ سے انھوں نے بے دھڑک فرعون کا چیلنج منظور کر لیا۔ مصریوں کے ہاں سال میں دو تین بڑے میلے ہوتے تھے۔ انہی میں سے کسی میلے کی تاریخ سامنے تھی۔ انھوں نے اسی میلے کے دن کو نامزد کر دیا اور وقت بھی مقرر کر دیا کہ لوگ چاشت کے وقت جمع ہوں۔ میلہ کا دن لوگوں کی فرصت و فراغت کا دن ہوتا ہے اور کسی پبلک اجتماع کے لیے چاشت کا وقت سب سے زیادہ موزوں خیال کیا جاتا ہے۔ گویا حضرت موسیٰ نے بھی یہ چاہا کہ اسی مقابلے میں فرعون کے سحر و شعبدہ کا سارا طلسم باطل کر دیں۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَیْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى (۶۰)

فرعون کی تیاریاں

'فَتَوَلّٰى' یعنی حضرت موسیٰ سے مذکورہ بالا قول و قرار کر کے فرعون وہاں سے ہٹا اور اپنی تدبیریں اکٹھی کرنے میں لگ گیا اور پھر پورے سر و سامان کے ساتھ میدانِ مقابلہ میں آیا۔ یہاں بات مختصر کر دی گئی ہے اس وجہ سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اس نے کیا تدبیریں کیں لیکن قرآن کے دوسرے مقامات میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ اس نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے یہ رائے دی کہ ان کا مقابلہ معمولی جادوگروں سے کرانے

میں شکست کا اندیشہ ہے اس وجہ سے مصلحت یہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں ہرکارے بھیج کر تمام ماہر جادوگر بلائے جائیں اور ان سے مقابلہ کرایا جائے۔ چنانچہ اسی تجویز پر عمل کیا گیا۔ مملکت کے ہر حصہ میں ہرکارے بھیجے گئے اور تمام بڑے بڑے جادوگر بلائے گئے۔

قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُم بِعَذَابٍ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرَىٰ (۶۱)

'سحت' کے اصل معنی ہڈی پر سے گوشت نوچنے کے ہیں۔ اسی سے 'اسحات' ہے جس کے معنی کسی چیز کا استیصال کر دینے اور اس کی جڑ اکھاڑ دینے کے ہیں۔

میدانِ مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ کی تقریر

یہ حضرت موسیٰؑ کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے میدانِ مقابلہ میں سب سے پہلے مجمع کے سامنے کی ہے۔ انھوں نے فرعون اور اس کے تمام ہم قوموں اور جادوگروں کو مخاطب کر کے بانداز تنبیہ فرمایا کہ تمھارا ناس ہو! تم ایک باطل کی حمایت میں حق کا مقابلہ کرنے آئے ہو۔ خدا پر جھوٹ تہمت نہ باندھو، کہ خدا تمھارا قلع قمع کر دے۔ یاد رکھو کہ جو خدا پر افترا کرتے ہیں وہ نامراد ہو کر رہتے ہیں۔

'افتراء علی اللہ' سے مراد، جیسا کہ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آئے ہیں، شرک ہے۔ شرک کو افتراء علی اللہ سے تعبیر کرنے کے وجوہ پر بھی ہم تفسیر سورۂ مائدہ اور سورۂ انعام میں گفتگو کر چکے ہیں۔ اوپر کی آیات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ فرعون سے مناظرہ اسی بات پر تھا کہ وہ مدعی رب ہونے کا تھا اور حضرت موسیٰؑ نے اس کے سامنے اس زعمِ باطل کی تردید فرمائی تھی کہ رب وہ ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور جس نے اس کی ہدایت اور پرورش کا انتظام فرمایا ہے نہ کہ تم جس کو نہ اس کے خلق میں کوئی دخل اور نہ اس کی تدبیر میں۔ اب وہی بات حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے تمام حامیوں کو مخاطب کر کے سنا دی کہ خدا کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے اگر تم اپنے جی سے کسی اور کو شریک و سہیم بناتے ہو تو یہ تم اپنی من گھڑت بات خدا پر لگاتے ہو۔ خدا کی طرف سے اس کی کوئی سند تمھارے پاس نہیں ہے اور یہ درحقیقت تم خدا پر افترا کر رہے ہو جس کی پاداش میں تم مستحق ہو کہ خدا تم پر ایک عذاب بھیج کر تمھیں فنا کر دے۔ جو لوگ اللہ پر افترا کرتے ہیں وہ بالآخر نامراد ہو کر رہتے ہیں۔

فَتَنَازَعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ وَأَسَرُّوا النَّجْوَىٰ (۶۲)

اعیانِ فرعون کی خفیہ میٹنگ

"تنازع فی الحدیث"، اور "تنازع امر" کا محاورہ عربی میں آپس میں تبادلۂ خیالات و آراء کے لیے آتا ہے۔ یعنی جب تمام اعیانِ حکومت اور سارے ساحر جمع ہو گئے تو ان کی آپس میں ایک خفیہ میٹنگ ہوئی۔ آگے کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میٹنگ میں نہایت رازدارانہ طور پر فرعون کی طرف سے ساحروں کے دل میں یہ بات اتارنے کی کوشش کی گئی کہ موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں نہایت ماہر جادوگر ہیں اور ان کی کوشش یہ ہے کہ یہ اپنے جادو کے زور سے بنی اسرائیل کو منظم کر کے ہمیں اس ملک سے بے دخل کریں اور ہماری تمام تہذیب و ترقی کو جو ہم نے پروان چڑھائی ہے، مٹا کے رکھ دیں تو یہ موقع غفلت کا نہیں ہے بلکہ متحدہ طاقت سے اس خطرے کا مقابلہ کرو اور یاد رکھو کہ جو آج کے معرکے میں جیتا وہی فتحمند رہے گا۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى (۶۳)

'اِنْ' مخففہ 'اِنَّ' کے معنی میں ہے اور اس کے بعد 'ل' ہے یہ اس کا قرینہ ہے۔ 'مُثْلٰی' 'امثل' کی مؤنث ہے۔ اس کے معنی اعلیٰ، عمدہ اور برتر کے ہیں۔

یہ وہ بات نقل ہوئی ہے جو خفیہ مجلس میں فرعون اور اس کے اعیان نے جادوگروں کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے خلاف بھڑکانے کے لیے کی۔

پہلی بات تو انھوں نے جادوگروں کے اندر پیشہ ورانہ رقابت کا جذبہ بھڑکانے کے لیے یہ کہی کہ یہ دونوں ماہر جادوگر ہیں۔ مقصد یہ کہ یہ اسی ہتھیار کے ساتھ میدان میں آئے ہیں جو تمھارے پاس بھی ہے تو اگر تم نے ان کے مقابلہ میں کمزوری دکھائی تو سب سے زیادہ ہوا خیزی تمھاری ہی ہوگی۔

دوسری بات یہ سجھائی کہ یہ اپنے جادو کے زور سے ہم پر اپنا رعب جمانا اور بنی اسرائیل کو منظم کرکے تمھیں تمھارے ملک سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہی کہ اس وقت تمھاری نہایت اعلیٰ اور شاندار تہذیب، جو تم نے اتنی محنت سے فروغ دی ہے، سخت خطرے میں ہے۔ اگر موسیٰؑ و ہارونؑ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگئے تو اس اعلیٰ تہذیب و تمدن کا یہ بیک قلم خاتمہ کر دیں گے۔

ان باتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ارباب اقتدار اہل حق کے مقابلہ میں ہمیشہ اسی طرح کے حربے استعمال کرتے رہے ہیں جس قسم کے حربے فرعون اور اس کے اعیان نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ 'تمھارا ملک' اور 'تمھاری تہذیب' کے الفاظ میں خطاب محض عوام فریبی کے لیے ہے ورنہ فرعونی حکومت اور فرعونی تہذیب میں ایک مخصوص ارسٹوکریسی کے سوا دوسروں کی حیثیت صرف غلاموں اور قلیوں کی تھی لیکن ارباب اقتدار جب عوام کو اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں تو اسی طرح ان کو نشہ پلاتے اور بے وقوف بناتے ہیں۔

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى (۶۴)

یہ وہ مشورہ ہے جو غور و فکر کے بعد ساحروں کو دیا گیا کہ چونکہ مرحلہ بہت نازک اور مقابلہ نہایت ماہر جادوگروں سے ہے اس وجہ سے سب ساحر مل کر اپنی مجتمعہ طاقت سے ایک متحدہ محاذ بنا کر مقابلہ کریں۔ اس شوریٰ کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی ہوگی کہ جس طرح سیاسی پارٹیوں میں باہم رقابتیں ہوتی ہیں، ہر ایک کی خواہش اور کوشش صرف اپنے مفاد کے لیے ہوتی ہے، اسی طرح پیشہ ور جماعتوں میں بھی آپس میں چشمک ہوتی ہے اور ہر ایک صرف اپنی برتری چاہتی ہے۔ فرعون اور اس کے اعیان کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ساحروں میں اس

طرح کا انتشار رہا تو شکست ہو جائے گی اس وجہ سے انھوں نے ان کو مشورہ دیا کہ الگ الگ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے بجائے سب مل کر متحدہ طاقت کے ساتھ مقابلہ کرو۔

'وَقَدۡ اَفۡلَحَ الۡیَوۡمَ مَنِ اسۡتَعۡلٰی' یہ اس دن کی نزاکت اور اہمیت کی طرف اشارہ ہے کہ آج کا دن فیصلہ کن ہے۔ اگر بازی ہماری رہی تو مستقبل کی کامیابی ہمارے لیے ہے اور اگر ہم ہار گئے تو پھر وہ تمام خطرات لازماً پیش آ کے رہیں گے جو موسٰیؑ اور ہارونؑ کی کامیابی کی صورت میں متصور ہیں۔

قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنۡ نَّکُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَلۡقٰی (۶۵)

حق اور باطل میدانِ مقابلہ میں

اس مشورت کے بعد جادو پر متحد ہو کر ساحر اور حضرت موسٰیؑ اپنی اپنی جماعتوں کے ساتھ میدانِ مقابلہ میں اترے۔ ساحروں نے آمنے سامنے ہوتے ہی اپنے پیشہ ورانہ اخلاق کے مطابق حضرت موسٰیؑ سے کہا کہ یا تو پہلے تم اپنا پانسہ پھینکو یا پھر ہم اپنا ہنر دکھاتے ہیں۔ ان کے اس قول سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اگرچہ انھوں نے موقع پہل کرنے کا حضرت موسٰیؑ کو بظاہر دیا لیکن دبی زبان سے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا کہ وہ پہل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس طرح کے مقابلوں میں تقدیم و تاخیر کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر فریق کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے پہلے ہی کرتب سے حاضرین کو اس طرح مسحور کر لے کہ دوسرے فریق کا حوصلہ پست ہو جائے۔

قَالَ بَلۡ اَلۡقُوۡا ۚ فَاِذَا حِبَالُہُمۡ وَ عِصِیُّہُمۡ یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِہِمۡ اَنَّہَا تَسۡعٰی (۶۶)

ساحروں کا کرتب

حضرت موسٰیؑ کو چونکہ اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا، اللہ تعالیٰ نے خود ان کو یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ تم ہر میدان میں کامیاب و فتح مند ہو گے اس وجہ سے انھوں نے خود پہل کرنے کے بجائے پہلے انہی کو موقع دیا کہ تمہی اپنا ہنر دکھاؤ۔ وہ تو پہلے ہی سے تیار تھے چنانچہ حضرت موسٰیؑ کے یہ کہتے ہی انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر ڈال دیں اور ان کے جادو کے سبب سے حضرت موسٰیؑ کو ایسا خیال ہوا کہ گویا وہ دوڑ رہی ہیں۔ چونکہ ساحروں کے علم میں یہ بات تھی کہ حضرت موسٰیؑ اپنی لٹھیا کو سانپ بنا دیتے ہیں اس وجہ سے انھوں نے اسی قسم کے جادو سے ان کو زک دینے کی کوشش کی اور اس پر اتنا اضافہ کر دیا کہ ان کی رسیاں بھی سانپوں کی طرح رینگنے لگیں۔ اپنے خیال میں تو انھوں نے حضرت موسٰیؑ کو شکست دینے کا پورا اہتمام کیا تھا اس لیے کہ حضرت موسٰیؑ کی ایک ہی لٹھیا سانپ بنتی تھی اور ان کی بہت سی لاٹھیاں سانپ بن گئیں اور مزید برآں انھوں نے رسیوں کو بھی سانپ بنا کر دکھا دیا لیکن یہ سب کچھ، جیسا کہ لفظ 'یُخَیَّلُ' سے واضح ہے، محض حاضرین کی قوتِ متخیلہ پر جادو کے ایک فوری اثر کا کرشمہ تھا۔ جادو سے کسی شے کی حقیقت و ماہیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی بلکہ محض دیکھنے والوں کے ذہن و خیال پر اس کا ایک فوری اثر پڑتا ہے اور اگر حقیقت سامنے آ جائے تو فوراً ہی اس کا طلسم باطل بھی ہو جاتا ہے۔

فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِہٖ خِیۡفَۃً مُّوۡسٰی (۶۷)

یہ منظر دیکھ کر فطری طور پر حضرت موسٰیؑ کے دل میں ذرا اندیشہ پیدا ہوا اس لیے کہ اب تک ان کے سامنے اپنی لٹھیا

کا اصلی کمال ظاہر نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ مقابلہ بہرحال سخت ہے۔ ہرچند اللہ تعالیٰ کے وعدے کی بنا پر ان کو یہ اطمینان تھا کہ فتح انھی کی ہوگی لیکن جب صورتِ حال توقع سے زیادہ پیچیدہ سامنے آجائے تو دل میں وقتی طور پر کچھ نہ کچھ ہراس پیدا ہوتا ہی ہے۔ اسی طرح کا ایک وقتی ہراس حضرت موسیٰؑ کے دل میں بھی پیدا ہوا۔ لفظ خِیْفَۃً کی تنکیر سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ خوف محض معمولی اور وقتی تھا۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی (۶۸)

حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کی اطمینان دہانی

حضرت موسیٰؑ کا یہ ہراس دور کرنے کے لیے فوراً یہ بشارت نازل ہوئی کہ تم ذرہ برابر بھی اندیشہ نہ کرو۔ انھوں نے کتنا ہی بڑا جادو دکھایا ہو لیکن غالب اور سربلند تمہی رہو گے۔

وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِکَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ط اِنَّمَا صَنَعُوْا کَیْدُ سٰحِرٍ ط وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی (۶۹)

معجزہ اور سحر کا فرق

ساتھ ہی یہ ہدایت ہوئی کہ یہ تمھارے ہاتھ میں جو لٹھیا ہے اس کو تم بھی ڈال دو۔ یہ ان کی اس ساری شعبدہ گری کو ہڑپ کر جائے گی۔ انھوں نے جو کچھ دکھایا ہے یہ محض ایک ساحر کا کرتب ہے اور ساحر جہاں بھی جائے کامیاب نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہاں اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ ساحر کا سحر حق کے مقابل میں کبھی نہیں ٹکتا لیکن بات ایک کلیہ کے رنگ میں کہی گئی ہے کہ ساحر کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتا اس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔ سحر کا تعلق تمام تر فریب نظر اور دیکھنے والے کی قوتِ متخیلہ سے ہے، اصل حقیقت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، پھر اس پیشہ کے لوگ ہمیشہ سوسائٹی کے اراذل و انفار سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں جو چند دن اپنی شعبدہ بازیوں سے کچھ سادہ لوحوں کو بیوقوف تو بنا لیتے ہیں لیکن سوسائٹی کی تعمیر و اصلاح میں کوئی کردار ان کا نہ ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ برعکس اس کے حضرات انبیاءؑ سے جو معجزے صادر ہوتے ہیں ان کے اندر ایک سطوت و جلالت ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا صدور ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہوتا ہے جو انسانیت کے گلِ سرسبد ہوتے ہیں جن کے دشمن بھی ان کے پاکیزہ اخلاق و کردار کی گواہی دیتے ہیں، جن کے ساتھ ایک عظیم دعوت ہوتی ہے جس کی حقانیت کی شہادت اس کے مخالفوں کے دل بھی دیتے ہیں۔ یہ لوگ جب دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو تاریخ کا ورق الٹ کر رخصت ہوتے ہیں۔ ان کی دعوت سے تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور دنیا ایک نیا جنم لیتی ہے۔ بتائیے کون ساحر ہے جس کا انسانی زندگی کے کسی شعبہ میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کارنامہ بھی ہوا! یہاں وہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھیے جس کی طرف ہم پیچھے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ ہمارے متکلمین نے معجزہ اور سحر میں منطق کے ذریعہ سے جو فرق کرنے کی کوشش کی ہے یہ ایک سعی لاحاصل ہے۔ ماہِ نخشب اور خورشید جہاں تاب کے درمیان فرق منطق کے ذریعے سے نہیں معلوم کیا جاتا! اس کا فیصلہ خود دیکھنے والے کر لیتے ہیں بشرطیکہ ان کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہوں۔

فَاُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ ھٰرُوْنَ وَمُوْسٰی (۷۰)

ساحروں کا اعتراف حق

یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے اپنی لٹھیا زمین پر ڈال دی اور اس نے ایک اژدھے کی طرح جادوگروں کے تمام سانپوں سنپولیوں کو نگلنا شروع کر دیا۔ جادوگروں نے یہ منظر جو دیکھا تو ان کی آنکھیں

کھل گئیں۔ جادوگر میں اگر کوئی رمق اعترافِ حق کی ہو تو وہ اپنے شعبدہ اور نبی کے معجزہ میں سب سے زیادہ امتیاز کرنے والا ہو سکتا ہے۔ ان ساحروں کے اندر حق شناسی کی رمق تھی۔ آگے آیت ۲، سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جادوگر یہ احساس پہلے سے رکھتے تھے کہ حضرت موسیٰؑ جو چیز پیش کر رہے ہیں جادو نہیں ہے چنانچہ وہ ان کے مقابل میں آنے سے کتراتے بھی تھے لیکن انھیں حکومت کے کارندوں نے سیاسی خطرات کا ہوا کھڑا کر کے آمادہ کیا کہ وہ ان کا مقابلہ کریں۔ وہ کہنے سننے سے مقابلہ کے لیے آ تو گئے لیکن جب انھوں نے اپنے شعبدہ کے مقابل میں حضرت موسیٰؑ کا اعجاز دیکھا تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ بے تحاشا سجدے میں گر پڑے۔ اس طرح سجدے میں گر پڑنا اس زمانے میں کسی کے کمالِ فن کے اعتراف کا ایک طریقہ تھا لیکن ان جادوگروں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ بھرے مجمع میں یہ اعلان بھی کر دیا کہ ہم ہارونؑ اور موسیٰؑ کے رب پر ایمان لائے۔ غور کیجیے ساری پبلک کے سامنے ساحروں کے اس اعترافِ شکست اور اس اعلانِ ایمان کے بعد فرعون اور اس کے درباریوں پر کیا گزری ہوگی! لیکن فرعون نہایت کائیاں سیاسی تھا اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے فوراً ایک نیا شغلہ چھوڑا۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى (۷۱)

فرعون کا سیاسی شغلہ

اس نے ساحروں سے کہا تم نے بدون میری اجازت کے موسیٰؑ کو سچا مان لیا۔ اب میں سمجھ گیا کہ درحقیقت وہی تمھارا گرو ہے جس نے تمھیں جادو کی تعلیم دی ہے اور تم نے باہمی سازش سے یہ فتح و شکست کا ڈراما دکھایا ہے تاکہ حکومت کی ہوا خیزی ہو اور تم موسیٰؑ کے اقتدار کے لیے راہ ہموار کرو۔ یہ حکومت کے خلاف تم نے سازش کی ہے اس وجہ سے میں تمھیں وہ سزا دوں گا جو ملک کے باغیوں کو دی جاتی ہے۔ میں پہلے تمھارے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کٹواؤں گا اور پھر عبرتِ عام کے لیے تمھیں کھجور کے تنوں پر سولی کے لیے لٹکاؤں گا۔ اس وقت تمھیں اندازہ ہوگا کہ میری سزا زیادہ سخت اور زیادہ پائیدار ہوتی ہے یا تمھارے گرو کی۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ ہزیمت نہایت رسواکن تھی لیکن فرعون نے اپنی کیادی سے اپنے ساتھیوں کا حوصلہ قائم رکھنے کے لیے ایک بات بنا ہی لی۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ۔ اوپر ساحروں کا جو قول نقل ہوا ہے اس سے واضح ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے صرف ایک سچے آدمی ہونے ہی کا اقرار نہیں کیا بلکہ نہایت تصریح کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ ہم ہارونؑ اور موسیٰؑ کے رب پر ایمان لائے۔ اس اعلان کے اندر ظاہر ہے کہ فرعون کے رب ہونے کا انکار بھی مضمر تھا جس کی زد فرعون کی خدائی اور اس کی بادشاہی دونوں ہی چیزوں پر پڑتی تھی اس وجہ سے اس کے لیے یہ مسئلہ محض دین و عقیدہ کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ بالواسطہ اس کے اقتدار کو ایک چیلنج تھا۔ بھلا اس جسارت کو وہ اپنی حکومت میں کس طرح گوارا کر سکتا تھا!

'اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ'۔ کبیر سے مراد استاد اور گرو کے ہیں۔ فرعون نے اپنی ذہانت سے عوام فریبی کے لیے یہ شگوفہ چھوڑا کہ اصل میں یہی شخص (حضرت موسیٰؑ) تمھارا گرو ہے، اسی نے تمھیں جادو کا یہ فن سکھایا ہے۔ تمھاری آپس میں ملی بھگت تھی۔ تم نے یہ طے کر رکھا تھا کہ تم اس طرح کھلے میدان میں اپنے اس گرو کے سامنے اپنی شکست مان لو گے جس سے اس کی دھاک تمام لوگوں پر بیٹھ جائے گی اور پھر تم حکومت کے خلاف جو سازش کرنا چاہتے ہو اس میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ ہر چند یہ بات بالکل بے تکی تھی۔ فرعون خود اپنے ہی منتخب کیے ہوئے میدان میں خود اپنی ہی لائی ہوئی فوج سے ہارا تھا لیکن اس شکست کا اثر مٹانے کے لیے اس کو کوئی نہ کوئی بات تو آخر بنانی تھی چنانچہ اس نے بنائی اور داد دینی چاہیے کہ اس نے بڑی سیاسی ذہانت کا ثبوت دیا اور کیا عجب کہ اس طرح وہ بہتوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب بھی ہو گیا ہو لیکن حق کو اس قسم کی پُر فریب باتوں سے نہیں دبایا جا سکتا۔

'فَلَاُقَطِّعَنَّ...الاٰيۃ' جب ساحروں کو حکومت کے خلاف سازش کا مجرم قرار دیا گیا تو ان کے لیے اس سزا کا بھی اعلان کر دیا گیا جو اس زمانے میں حکومت کے خلاف سازش کرنے والوں کو دی جاتی تھی یعنی ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے جائیں اور ان کو برسرِ عام سولی دی جائے تاکہ دوسروں کو بھی عبرت حاصل ہو۔ 'فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ' سے مقصود اس کے برسرِ عام ہونے کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

ساحروں کا ایک وہم

'وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى' یعنی تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر تم نے اپنے گرو کی مرضی کے خلاف کیا تو وہ اپنے جادو کے زور سے تم کو کسی آفت میں مبتلا کر دے گا اس وجہ سے اس کے آلۂ کار بنے ہوئے ہو۔ لیکن جب میری سزا کا مزا چکھو گے تو تمھیں پتہ چل جائے گا کہ میری سزا تمھارے گرو کی سزا کے مقابل میں کہیں زیادہ سخت اور پائیدار ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جادوگروں میں یہ وہم پایا جاتا ہے کہ اگر کوئی بات گرو کی مرضی کے خلاف کی جائے اور وہ کسی شاگرد سے ناراض ہو جائے تو اس شاگرد کو وہ اپنے جادو کے زور سے کسی بہت بڑی آفت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ فرعون نے اسی وہم کو سامنے رکھ کر جادوگروں کو متنبہ کیا کہ تم اپنے گرو کی سزا سے ڈرتے ہو لیکن میری سزا اس کی سزا سے کہیں زیادہ سخت اور عبرت انگیز ہوگی۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۷۲)

ایمان کا کرشمہ!

فرعون نے دھمکی تو بڑی سخت سنائی اور اسے توقع یہی ہوگی کہ وہ اس دھمکی سے ساحروں کو مرعوب کر لے گا لیکن اب اس کا سابقہ پیشہ ور جادوگروں سے نہیں بلکہ راسخ الایمان مومنوں سے تھا۔ انھوں نے فرعون کی یہ دھمکی سن کر کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر صاف سنا دیا کہ تمھیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو اب ہم ان روشن نشانیوں پر جو ہمارے مشاہدے میں آ چکی ہیں اور اپنے اس خالق پر جس نے ہمیں وجود بخشا ہے تمھیں ترجیح دینے والے نہیں ہیں۔ تم اگر کچھ کر سکتے ہو تو اسی دنیا کی زندگی کا کر سکتے ہو اور ہمیں اس دنیا کی زندگی کی کوئی پروا نہیں ہے ــــ دیکھا آپ نے

ایمان کا کرشمہ! یہ وہی جادوگر ہیں جن کا حال قرآن میں دوسری جگہ یہ بیان ہوا ہے کہ جب وہ مقابلہ کے لیے بلائے گئے تو انھوں نے بڑی لجاجت کے ساتھ فرعون سے اپنی کامیابی کی صورت میں انعام کی درخواست کی یا اب ایمان کے نور نے ان کے دلوں کو اس طرح منور کر دیا کہ خدا اور آخرت کے سوا اس دنیا کی کسی چیز کی ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت باقی نہیں رہی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کی راہ میں اپنی زندگی بھی قربان کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔

اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۷۳)

انھوں نے مزید فرمایا کہ ہم اپنے رب پر اس امید کے ساتھ ایمان لائے ہیں کہ وہ ہماری ان تمام غلطیوں کو بھی معاف فرمائے گا جو ہم سے صادر ہوئی ہیں اور اس سحر سے بھی درگزر فرمائے گا جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا اور اللہ ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔

'وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ' سے صاف واضح ہے کہ یہ لوگ حضرت موسیٰ کے مقابلہ کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ جانتے تھے کہ حضرت موسیٰ جو چیز پیش کر رہے ہیں یہ جادو نہیں ہے، کچھ اور ہی شے ہے لیکن حکومت کے دباؤ سے انھیں آنا پڑا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر حقیقت اس طرح واضح کر دی کہ ان کا سینہ اس کے اعتراف و اعلان کے لیے کھل گیا۔

'وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى' یہ فرعون کی بات 'اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى' کا جواب ہے جو بالکل صحیح بھی ہے اور بھرپور بھی۔ انھوں نے فرمایا کہ تم ہمیں اپنی سزا سے ڈراتے ہو کہ وہ نہایت سخت اور پائیدار ہوگی لیکن ہم نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپنے رب کو اختیار کیا ہے جو تمام دنیا و مافیہا سے بہتر بھی ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (۷۴)

ایک تضمین

یہ اور اس کے بعد کی دو آیتیں میرے نزدیک بطور تضمین ہیں۔ جس طرح اوپر آیات ۵۳-۵۶ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی تقریر کے ساتھ اپنی بات ملا کر اس کو مکمل اور مطابق حال کر دیا ہے اسی طرح ان لوگوں کے جواب کے ساتھ اپنی بات ملا کر اس کو مکمل اور مطابق حال کر دیا ہے۔ ان آیات کو تضمین ماننے کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ان میں جزا و سزا اور آخرت کا حال جن الفاظ میں بیان ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کے شایانِ شان ہیں اور ان کا انداز اوپر کی آیات کے انداز سے بالکل مختلف ہے۔ فرمایا کہ جو اپنے رب کے حضور مجرم کی حیثیت سے حاضر ہوگا تو اس کے لیے دوزخ ہے جس میں نہ وہ مرے گا اور نہ جیے گا۔ مجرم کی حیثیت سے، یعنی جس نے خدا کی نافرمانیاں کیں اور اس کو توبہ و اصلاح کی توفیق نہ ہوئی۔ 'لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى' اس عذاب کی شدت، اس کے خلود اور اس کی بے پناہی کی ایسی تعبیر ہے کہ اپنے لفظوں میں اس کو واضح کرنا ممکن نہیں، بڑی سے بڑی مصیبت بھی ہو تو اس سے نجات کے لیے موت بہرحال ایک آخری چارہ کار رہے

لیکن جہاں موت بھی نہ ہو اور موت کے مصائب ہر طرف سے پلے پڑ رہے ہوں وہاں کوئی کدھر جائے گا۔

وَمَن يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّلِحٰتِ فَأُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى (۷۵)

یہ ان کے مقابل میں فائز المرام گروہ کا بیان ہوا کہ البتہ جو لوگ ایمان کے ساتھ خدا کے پاس حاضر ہوں گے اور اس کے ساتھ انھوں نے نیک اعمال بھی کیے ہوں گے ان کے لیے مراتب عالیہ ہیں۔

ایمان کی مقبولیت کے لیے اعمال صالحہ شرط ہیں

'مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّلِحٰتِ' کے اسلوب بیان پر غور کیجیے تو یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ایمان وہی ہے جس کے ساتھ عمل صالح بھی پایا جاتا ہے۔ جو ایمان عمل صالح سے خالی ہو اس کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔ ایسا ایمان ایک ٹھونٹھ درخت کے مانند ہے جو برگ و بار سے بالکل خالی ہے۔ جس درخت نے دنیا میں اپنے برگ و بار پیدا نہیں کیے آخر وہ آخرت میں کس طرح ثمر بار ہو جائے گا! خدا کے ہاں اعمال کی مقبولیت کے لیے جس طرح ایمان شرط ہے اسی طرح ایمان کی مقبولیت کے لیے اعمالِ صالحہ شرط ہیں۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَن تَزَكّٰى (۷۶)

جنت ایک سستی چیز نہیں

یہ وضاحت ہے ان مراتب عالیہ کی۔ یعنی ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ فرمایا کہ 'وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَن تَزَكّٰى' یہ صلہ ہے ان لوگوں کا جو اپنے ظاہر و باطن اور اپنے عقیدہ و عمل کو پاکیزہ بنائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جھوٹی تمناؤں سے ملنے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے حق دار وہی ٹھہریں گے جو اس کے حاصل کرنے کے لیے اپنے نفس کو ہر قسم کی آلائشوں سے، خواہ وہ فکری و نظری ہوں یا عملی و اخلاقی، پاک کرنے کی جد و جہد کریں گے۔ اس راہ میں آدمی کو جو ٹھوکریں لگتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے تدارک کی تدبیریں بھی اپنی اس کتاب میں بتا دی ہیں اور انسان اپنی کمزوریوں کی وجہ سے جن رعایتوں کا محتاج ہے وہ بھی اس کو بخشی گئی ہیں۔ ان چیزوں میں سے کسی چیز کا انکار دین میں غلو اور تشدد ہے لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جن لوگوں نے محض اپنے جی سے عمل کی اہمیت گھٹا کر اباحت کے دروازے کھول دیے ہیں، خواہ وہ ہمارے پرانے متکلمین ہوں یا نئے متکلمین، انھوں نے اپنی فیاضی سے جنت کو ایک بہت سستی چیز تو ضرور بنا دیا ہے اور اس سے ہم جیسے بے عملوں کو بڑی تسلی مل جاتی ہے لیکن قرآن میں ان کے اس نظریے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اور جنت کی کنجی بہرحال اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ اس نے ان متکلمین کے ہاتھ میں نہیں پکڑا دی ہے اس وجہ سے سلامتی اسی میں ہے کہ اس قسم کی جھوٹی آرزوؤں سے اپنے آپ کو محفوظ ہی رکھیے۔ قرآن نے ان کو یہود کی امانی باطلہ میں سے شمار کیا ہے اور ان کی تفصیل سورہ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَآ إِلٰى مُوسٰٓى أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَلَا تَخْشٰى (۷۷)

'فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا'۔ 'ضرب طریق' کے معنی عربی محاورہ کے لحاظ سے تو، جیسا کہ صاحب کشاف

نے تصریح کی ہے، راستہ بنا لینے کے ہیں لیکن یہاں اس لفظ کے استعمال میں ایک لطیف کنایہ حضرت موسیٰ کے عصا کی طرف بھی ہے اس لیے کہ اس راستہ کے بنانے میں حضرت موسیٰ کے عصا کو بھی دخل تھا اور عصا کی مناسبت لفظ ضرب کے ساتھ واضح ہے۔

حذف کی ایک مثال

'لَا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشٰى' میں 'تَخْشٰى' کا مفعول تقابل کے اصول پر میرے نزدیک محذوف ہے۔ اس محذوف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی۔ 'لَا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشٰى غَرَقًا' یعنی نہ تم کو فرعون کی طرف سے پا لیے جانے کا کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ سمندر میں ڈوبنے کا کوئی خطرہ ہوگا۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔ میں نے ترجمہ میں اس حذف کو کھول دیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کو ہجرت کا حکم

یہاں حضرت موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کا ایک طویل حصہ حذف کر دیا گیا ہے، جس پر سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے فرعون سے یہ مطالبہ جو کیا کہ میرے ساتھ بنی اسرائیل کو عید قربانی منانے کے لیے جانے دے تو فرعون نے اس مطالبہ کو ماننے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اس ظلم و تشدد میں اس نے مزید اضافہ کر دیا جو اب تک اس کے اور اس کے کارندوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر ہو رہا تھا اس دوران میں یکے بعد دیگرے اللہ تعالیٰ نے مصر پر مختلف آفتیں نازل کیں کہ فرعون کی آنکھیں کھلیں لیکن جب کوئی مصیبت آتی تب تو وہ حضرت موسیٰ کی خوشامدیں کرتا کہ اگر تمھاری دعا سے یہ آفت ٹل گئی تو میں بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ جانے دوں گا لیکن حضرت موسیٰ کی دعا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جب آفت ٹل جاتی تو پھر اس کی سرکشی عود کر آتی اور وہ اپنے عہد سے مکر جاتا۔ اسی نزاع میں کئی سال بیت گئے۔ اس دوران میں حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کی قوم پر اپنا وہ فرض رسالت اچھی طرح ادا کر دیا جو ایک رسول کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتا تھا۔ بالآخر جب فرعون اور اس کی قوم پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہوگئی تب حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ وہ بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے ہجرت کر جائیں۔

اب تک تو حضرت موسیٰ کا مطالبہ، جیسا کہ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں صرف یہ تھا کہ ان کو بنی اسرائیل کے ساتھ تین دن کی راہ بیابان میں قربانی کے لیے جانے کی اجازت دی جائے[1] لیکن اب چونکہ وہ فرعون اور اس کی قوم پر اتمام حجت کر چکے تھے اس وجہ سے سنتِ الٰہی کے مطابق ان کو اس علاقے سے ہجرت کا حکم ہو گیا۔ ارشاد ہوا کہ راتوں رات میرے بندوں کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ۔ 'میرے بندوں' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے تھے۔ ان میں عظیم اکثریت تو بنی اسرائیل ہی کی تھی لیکن ایک مختصر جماعت ان میں ان لوگوں کی بھی شامل تھی جو مصریوں میں سے ایمان لائے تھے۔ اوپر جن جادوگروں کے ایمان لانے کا ذکر ہے قرائن شاہد ہیں کہ وہ بنی اسرائیل میں سے نہیں بلکہ مصریوں میں سے تھے۔ لفظ 'عِبَادِيْ' ان تمام لوگوں پر مشتمل ہے جو حضرت موسیٰ پر ایمان لائے، عام اس سے کہ وہ مصری تھے یا اسرائیلی۔ قرآن میں ایک مومن آلِ فرعون

---

[1] استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو قربانی کے لیے مکہ معظمہ لے جانا چاہتے تھے۔

کا ذکر بھی خاص طور پر ہوا ہے۔

قدرتِ خداوندی کا کرشمہ

'فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ' بحر سے مراد یہاں بحر احمر کی شمالی خلیج ہے۔ ہدایت ہوئی کہ پوری جماعت کے ساتھ ساحل سمندر پر پہنچو اور وہاں اپنی لاٹھیا سمندر پر مار کر اس کے اندر سے لوگوں کے لیے خشک راہ پیدا کر لو۔ یہ اسلوب بیان اس اختیار کو ظاہر کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے معجزے کے ذریعے سے حضرت موسیٰؑ کو بخشا کہ تم اس کے اشارے سے سمندر کو حکم دو گے تو وہ تمہارے گزرنے کے لیے خشک راستہ نکال دے گا۔

'الْبَحْر' پر الف لام اس بات کا قرینہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو متعین طور پر اس جگہ کی نشان دہی کر دی گئی تھی جہاں ان کو پہنچنا تھا۔ اس واقعہ کے متعلق تورات میں جو تفصیل آئی ہے وہ ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ اس موقع پر شانِ خداوندی کس شکل میں ظاہر ہوئی۔ کتاب خروج باب ۱۴ ملاحظہ ہو۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے؟ بنی اسرائیل سے کہہ کہ وہ آگے بڑھیں اور تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اس کو دو حصے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے۔ ....

..... پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے دہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا۔ اور مصریوں نے تعاقب کیا۔" (۱۴: ۱۵-۲۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معجزہ پوربی ہوا کے تصرف سے ظہور میں آیا۔ اس سے خلیج کا پانی اس طرح دو حصوں میں منقسم ہو گیا کہ بنی اسرائیل کے گزرنے کے لیے خشک راستہ پیدا ہو گیا۔

فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ (۷۸)

فرعون اور اس کی فوجوں کی غرقابی

'فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ' عربی میں یہ اسلوب بیان کسی چیز کی ایسی ہولناکی یا عظمت کے اظہار کے لیے آتا ہے جس کو الفاظ تعبیر کرنے سے قاصر ہوں۔

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے معجزات سے تنگ آکر اگرچہ فرعون نے ان کو جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن ان کی روانگی کے بعد اس کی رائے بدل گئی اور اس نے فوج کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور بالآخر اپنی فوج سمیت سمندر کی بے پناہ موجوں کی لپیٹ میں آگیا اس کی تفصیل تورات میں یوں آتی ہے۔

"جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیے تو فرعون اور اس کے خادموں کا دل ان لوگوں کی طرف سے پھر گیا اور وہ کہنے لگے کہ یہ ہم نے کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر ان کو جانے دیا۔ تب اس نے اپنا رتھ تیار کروایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لیا اور اس نے چھ سو چنے ہوئے رتھ بلکہ مصر کے سب رتھ لیے اور ان سبھوں میں سرداروں کو بٹھایا۔" خروج باب ۱۴: ۵-۷

اس کے بعد ان کے غرق ہونے کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے:۔

" اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا تاکہ پانی مصریوں اور ان کے رتھوں اور سواروں پر پھر بہنے لگے اور موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آگیا اور مصری الٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے مصریوں کو سمندر کے بیچ ہی میں تہ و بالا کر دیا اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا، غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا۔ پر بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی ان کے دہنے اور بائیں ہاتھ دیوار کی طرح رہا۔" خروج باب ۱۴: ۲۶ - ۲۹

وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى (۷۹)

قائد کی اصل ذمہ داری

یہ فرعون اور اس کی تباہ کن قیادت پر اظہارِ افسوس ہے کہ اس نے اپنی گمراہ کن روش کے سبب سے اپنی قوم کو ہلاکت کے سمندر میں غرق کیا، ان کی صحیح رہنمائی نہ کی 'وَمَا هَدٰى' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قائد اور حکمران کی اصل ذمہ داری اپنی قوم کی صحیح رہنمائی ہے۔ اس کی حیثیت در حقیقت ایک راعی کی ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنی خلق کے کسی گلہ کی چرواہی اور اس کی حفاظت پر مامور فرماتا ہے۔ بدبخت ہے وہ چرواہا جو اپنی انانیت پر پورے گلے کو بھینٹ چڑھا دے!

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝ (۸۰ - ۸۲)

بنی اسرائیل کو تنبیہ

دریا پار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنے عظیم احسانات یاد دلا کر ان کو وہ عظیم ذمہ داری یاد دلائی جو ان احسانات کے حق کے طور پر ان پر عائد ہوتی تھی اور ساتھ ہی اس انجام سے بھی آگاہ فرما دیا جو ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو ان نعمتوں کی ناقدری کریں گے اور شکر کے بجائے کفر اور طغیان کی راہ اختیار کریں گے بعینہٖ اسی سیاق و سباق میں، الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ یہ مضمون سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم تفصیل کے ساتھ اس کے ہر پہلو کی وضاحت کر چکے ہیں اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارات پر اکتفا کریں گے۔ تفصیل کے طالب بقرہ کی تفسیر میں آیات ۴۰ - ۶۰ کے تحت جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

'وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ' سے مراد وہ وعدہ ہے جو تورات دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے واسطہ سے بنی اسرائیل سے فرمایا اور جس کے لیے اس نے ان کو طور کے اسی مقدس جانب میں بلایا جہاں مدین سے واپس ہوتے ہوئے حضرت موسیٰؑ کو نبوت عطا ہوئی ——— اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی

جو قدر بنی اسرائیل نے کی اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

'وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى'۔ 'منّ'، 'وسلوٰی' کی وضاحت بقرہ آیت ۵۷ کے تحت ہو چکی ہے۔ اس نعمت کی بھی بنی اسرائیل نے جو قدر کی اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

'كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ' یہاں نعمتوں کا حق بیان ہوا ہے۔ اس حق کی یاد دہانی ہر نعمت زبانِ حال سے بھی کرتی ہے اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے ان کے نبی کے واسطہ سے لفظوں میں بھی بار بار اس کی ہدایت فرمائی تھی۔ تورات میں اس کے شواہد موجود ہیں۔ 'وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ خدا کی نعمتوں کی فراوانی تم کو طغیان میں مبتلا نہ کرنے پائے۔ یہ طغیان فرعون کی روایت ہے اور اس کا انجام تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔

'وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى' یعنی اس قسم کا طغیان خدا کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ اور جس پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے وہ گر کے رہتا ہے۔ 'گر کے رہتا ہے' یعنی عزت کے عرش سے ذلت کے فرش پر۔ یہ ماجرا بھی تم اپنی آنکھوں دیکھ چکے ہو کہ جو خدائی کا مدعی تھا اس کا انجام کیا ہوا!

'وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى' یہ ان لوگوں کے لیے راہِ نجات بتا دی جو ان ہدایات پر عمل کا عزم بالجزم رکھتے ہیں۔ فرمایا کہ اس طرح کے لوگوں سے اگر کوئی غلطی صادر ہو تو اس کی اصلاح کا طریقہ توبہ ہے۔ وہ اپنی غلطی سے رجوع کریں، ایمان اور عمل صالح کی تجدید کریں اور آئندہ کے لیے خدا سے مزید ہدایت کے طالب بنیں۔

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى (۸۳-۸۴)

عربیت کا ایک اسلوب

'اَعْجَلَكَ' کے بعد 'عَنْ' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں کوئی ایسا فعل محذوف مانا جائے جو چھوڑ کر آنے کے مفہوم میں ہو۔ اس لیے کہ 'عن' 'اعجلک' کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا اور ہم عربیت کے اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ کرتے آئے ہیں کہ جب فعل اور اس کے صلہ میں مناسبت ظاہری نہ ہو تو وہاں وہ فعل کسی ایسے فعل پر متضمن ہوتا ہے جو اس صلہ سے مناسبت رکھتا ہو۔ اس اصول کی روشنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ 'اے موسیٰ تمہیں اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی چلے آنے پر کس چیز نے ابھارا؟'

تورات کے حصول کے لیے حضرت موسیٰؑ کی عجلت

یہ اس موقع کا ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو طور کے اسی مقام پر، جہاں ان کو نبوت عطا ہوئی تھی، تورات دینے کے لیے بلایا ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تیس دن کی مدت مقرر کی تھی لیکن حضرت موسیٰ فرطِ شوق میں، قوم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری حضرت ہارونؑ کے سپرد کر کے، وقت سے کچھ پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ تورات میں اس کا ذکر ہے لیکن اس میں کسی مدت یا حضرت موسیٰ کی کسی عجلت کا ذکر نہیں ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ پہاڑ پر میرے پاس آ اور وہیں ٹھہرا رہ اور میں تجھے پتھر کی لوحیں اور شریعت

اور احکام جو میں نے لکھے ہیں دوں گا تاکہ تو انھیں سکھائے اور موسٰی اور اس کا خادم یشوع اٹھے اور موسٰی خدا کے پہاڑ کے اوپر گیا اور بزرگوں سے کہہ گیا کہ جب تک ہم لوٹ کر تمھارے پاس نہ آجائیں تم ہمارے لیے یہیں ٹھہرے رہو اور دیکھو ہارون اور حور تمھارے ساتھ ہیں جس کسی کا کوئی مقدمہ ہو وہ ان کے پاس جائے۔"
خروج باب ۲۴ : ۱۲-۱۴

اعراف میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً	اور ہم نے موسٰی سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس
وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ	کو پورا کیا دس مزید راتوں سے تو اس کے رب کی
رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ	مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی اور موسٰی نے
مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ	اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ میری قوم میں میری
قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ	جانشینی کرنا اور اصلاح کرتے رہنا اور فساد کرنے والوں
الْمُفْسِدِيْنَ (۱۴۲-الاعراف)	کی روش کی پیروی نہ کرنا۔

حضرت موسٰی نے اللہ تعالیٰ کے اس سوال کا جواب یہ دیا کہ اے میرے رب! میری قوم کے لوگ بھی بس میرے پیچھے ہی ہیں اور میں وقت موعود سے ذرا پہلے تیری خوشنودی کے لیے چلا آیا ہوں۔

حضرت موسٰی کی یہ عجلت، جیسا کہ ان کے ارشاد سے واضح ہے، محض فرطِ شوق کا نتیجہ اور خدا کی رضا طلبی کے لیے تھی۔ اس پہلو سے یہ کوئی برائی نہیں بلکہ محبتِ الٰہی کا تقاضا تھی لیکن یہی عجلت ان کے لیے ایک شدید آزمائش اور ان کی قوم کے لیے ایک سخت فتنہ بن گئی۔ ان کی قوم کے اندر جو اشرار و مفسدین تھے انھوں نے ان کی اس غیبت سے فائدہ اٹھا کر قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا کر دیا اور حضرت ہارونؑ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود صورتِ حال پر قابو پانے میں ناکام رہے۔ حضرت موسٰی کی قوم کا مزاج اس وقت تک سخت منفعل تھا۔
سورۂ اعراف میں ان کا حال بیان ہو چکا ہے کہ دریا پار کرنے کے معاً بعد جب ان کو بت پرست قوموں سے سابقہ پیش آیا تو انھوں نے حضرت موسٰی سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے لیے بھی اسی طرح کا ایک بت بنا دیں جس طرح کے بت ان قوموں کے پاس ہیں۔ یہ واقعہ حضرت موسٰی کے طور پر جانے سے کچھ ہی پہلے کا ہے۔ اس پر حضرت موسٰی نے ان مفسدین کو ڈانٹ بھی بتائی تھی۔ حضرت موسٰی اپنی قوم کے مفسدین سے بھی واقف رہے ہوں گے اور اس امر کا بھی سب سے بہتر وہی اندازہ کر سکتے تھے کہ ان بگڑے ہوئے لوگوں کو حضرت ہارونؑ کس حد تک کنٹرول میں رکھ سکیں گے۔ ایسے حالات کے اندر ان کی چند روزہ کی غیر حاضری بھی قوم کے لیے آزمائش بن سکتی تھی لیکن غلبۂ شوق میں وہ ان پہلوؤں کا کماحقہٗ اندازہ نہ فرما سکے اور اس کا نتیجہ نہایت خطرناک شکل میں سامنے آیا۔

یہ بات ہم جگہ جگہ ظاہر کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام سے اگر کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ اتباع ہوا

کی نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی وہ حق اور خدا کی رضا طلبی کی راہ میں حدِ مطلوب سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز فی نفسہٖ کوئی برائی نہیں ہے لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ میزانِ حق ہوتے ہیں اور ان کا ہر قول و فعل دوسروں کے لیے نمونہ ہوتا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح کی باتوں پر بھی گرفت فرماتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی اس عجلت پر بھی گرفت ہوئی۔ اس سورہ میں، جیسا کہ آپ تمہید میں پڑھ آئے ہیں، ہمارے حضورؐ کو صبر اور انتظار کی تعلیم دی گئی ہے اس وجہ سے اس میں حضرت موسیٰؑ کی زندگی سے اس واقعہ کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کی راہ میں صبر اور انتظار ہی کی روش قرینِ مصلحتِ الٰہی ہے ورنہ بعض اوقات نیک سے نیک ارادہ کے ساتھ بھی جو عجلت کی جاتی ہے وہ بہتوں کے لیے مزلّۂ قدم بن جاتی ہے۔

قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنۢ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ ٱلسَّامِرِيُّ (۸۵)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو خبر دی کہ تم تو ہماری رضا جوئی کے شوق میں قوم کو چھوڑ کر وقت سے پہلے چلے آئے اور تمہارے بعد ہم نے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے اس کو گمراہی میں مبتلا کر دیا۔

'فَتَنَّا قَوْمَكَ' میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیت 'فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا' کے تحت ہم کر آئے ہیں۔ افراد ہوں یا اقوام، نیک ہوں یا بد، سب کی آزمائش ہر وقت ہوتی رہتی ہے اور اسی آزمائش کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کھرے اور کھوٹے کو ممیز کرتا ہے۔ یہاں مقصود یہ بتانا ہے کہ ہم نے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈالا اور وہ اس امتحان میں فیل ہو گئی۔ سامری نے اس کو گمراہ کر ڈالا۔

سامری کا فتنہ

سامری کا کوئی ذکر تورات میں نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کے متعلق صرف اتنی ہی بات علم میں آئی ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے اور جو آگے آرہی ہے۔ تورات کے راویوں نے تو اس سارے فتنہ کو حضرت ہارونؑ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ یہ قرآن کا احسان ہے کہ اس نے اس فتنہ کے اصل بانی کا پتہ دیا اور حضرت ہارونؑ کو اس تہمت سے بری کیا۔

سامری کوئی اسرائیلی تھا یا ان مصریوں میں سے تھا جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہجرت کی؛ یہ ایک غیر متعلق اور غیر مفید سوال ہے۔ ہم اس غیر ضروری بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ قرآن سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک نہایت ہی فتین اور کیاد منافق تھا جو محض اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے حضرت موسیٰؑ کی جماعت میں گھسا ہوا تھا۔ آگے کی آیات سے معلوم ہوگا کہ اس کو متصوفانہ قسم کے کشوف و کرامات کے ڈھونگ رچانے کا فن بھی معلوم تھا۔ اس قسم کے چالاک لوگ بڑی آسانی سے سادہ لوح عوام کو اپنے دامِ فریب میں پھنسا لیتے ہیں۔ اس نے حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کچھ تو وقت سے پہلے چلے گئے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ تربیت کے تحت ان کی مدتِ قیام میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا۔ اس طرح سامری کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے بنی اسرائیل کے ان تمام عناصر کو اپنے اردگرد اکٹھا کر لیا جو پہلے ہی سے بت پرستانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ اس نے ان کو سمجھایا کہ موسیٰؑ تو معلوم

نہیں خدا کی تلاش میں کہاں گئے، اگر تم لوگ اپنے زیورات چندے میں دو تو میں تمھارے لیے ایک معبود بنائے دیتا ہوں جو تمھاری رہنمائی کرے گا۔ موسیٰ تو تمھیں یہاں چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے، اب تم کب تک انتظار کرو گے! سامری مصر کے فنِ بت گری کا بھی ماہر تھا اس نے لوگوں کے دیے ہوئے زیورات سے ایک بچھڑا بنایا جس کی شکل ایسی تھی کہ جب اس میں سے ہوا گزرتی تو اس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی۔ اس نے اس آواز کو جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، اپنی ایک کرامت کا نتیجہ قرار دیا اور سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت ہارونؑ نے لوگوں کو اس فتنہ سے بچانے کے لیے پورا زور لگایا لیکن جو لوگ حضرت موسیٰؑ کے دبدبہ سے دبے ہوئے تھے ان کو وہ دبانے میں کامیاب نہ ہو سکے یہاں تک کہ ان کی جان بھی خطرے میں پڑ گئی اور انھوں نے یہ بھی محسوس فرمالیا کہ اب اگر انھوں نے کوئی مزید قدم اٹھایا تو اس سے فائدہ کے بجائے الٹا نقصان ہوگا، جماعت کا شیرازہ بالکل درہم برہم ہو جائے گا اس وجہ سے انھوں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ حضرت موسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کریں۔

فَرَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ أَمْ أَرَدتُّمْ أَن يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُم مَّوْعِدِي (۸۶)

حضرت موسیٰؑ کی واپسی اور قوم پر ان کا عتاب

جب حضرت موسیٰؑ کو اس حادثہ کی خبر ملی تو اس کا جو اثر قدرتی طور پر ہونا تھا وہ ہوا۔ وہ نہایت غصہ اور غم کی حالت میں قوم کی طرف واپس آئے۔ غصہ تو ان کو مفسدین کی کامیاب شرارت پر تھا کہ انھوں نے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا اور آگے کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح صورتِ حال سامنے نہ ہونے کے سبب سے حضرت ہارونؑ پر بھی تھا کہ ان کو مفسدین سے ہوشیار رہنے کی جو ہدایت انھوں نے فرمائی تھی اس کو ملحوظ رکھنے میں وہ ناکام رہے۔ اور غم اپنی قوم کی اس بدبختی پر کہ میں تو اس کے لیے اللہ کی کتاب لینے گیا اور یہ ایک بچھڑا بنا کر اس کی عبادت میں لگ گئی!

انھوں نے سب سے پہلے قوم کو سرزنش فرمائی کہ نادانو، یہ تم کیا کر بیٹھے! کیا خدا نے تم سے نہایت مبارک وعدہ کتاب و شریعت دینے کا نہیں فرمایا تھا؟ کیا اس وعدے کے پورے ہونے میں اتنی دیر ہو گئی کہ تم صبر نہ کر سکے؟ کیا تم نے یہ چاہا کہ تم پر خدا کا غضب نازل ہو کہ تم اس عہد کو توڑ بیٹھے جو میں تم سے لے کر گیا تھا۔ اس عہد سے مراد وہ عہد ہے جس کا حوالہ ہم پیچھے نقل کر آئے ہیں کہ طور پر جاتے وقت قوم کے تمام سرداروں کو حضرت موسیٰؑ نے یہ ہدایت فرمادی تھی کہ میں شریعت لینے جا رہا ہوں، جب تک میں واپس نہ آؤں لوگ یہیں ٹھہرے رہیں اور تمام معاملات میں حضرت ہارونؑ کی ہدایات کی پیروی کریں۔

قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلَٰكِنَّا حُمِّلْنَا أَوْزَارًا مِّن زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنَاهَا فَكَذَٰلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ (۸۷)

اس آیت کے ایجاز کے سبب سے اس کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ ہم

اپنے لفظوں میں اس کا مطلب بیان کریں گے اس کے بعد اس کے الفاظ کی وضاحت کریں گے۔

قوم کے بزرگوں کی معذرت

حضرت موسیٰؑ نے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، سب سے پہلے قوم کے ان بزرگوں کو سرزنش کی جن پر انھوں نے اپنی غیر حاضری میں لوگوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ڈالی تھی۔ ان لوگوں نے اپنی مجبوری و بے بسی بیان کی کہ یہ جو کچھ ہوا اس میں ہمارے ارادے اور ہماری مرضی کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ لوگوں کے زیورات کی امانت کا جو لوجھ ہمارے اوپر تھا وہ لوگوں کے مطالبے پر ہم نے اپنے سر سے اتار دیا اور اس طرح سامری نے ان کے لیے یہ بچھڑا ڈھال کر تیار کر دیا۔ یعنی یہ جرم سر تا سر سامری اور اس کے فریب میں آئے ہوئے ان عوام کا ہے جن کے زیورات ہماری امانت میں تھے۔ ہم ان کے دباؤ میں آکر ان کے زیورات ان کے حوالہ کرنے پر مجبور ہو گئے اور ان زیورات سے سامری نے یہ فتنہ کھڑا کر دیا۔

'مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا'۔ 'ملك' کے معنی اختیار و اقتدار کے ہیں۔ یعنی آپ ہم سے جو عہد لے کر گئے تھے ہم نے اپنے امکان کے حد تک اس پر قائم رہنے کی پوری کوشش کی لیکن حالات اس قدر قابو سے باہر ہو گئے تھے کہ ہمارے لیے عوام کو کنٹرول میں رکھنا ناممکن ہو گیا۔

'وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ'۔ 'زِيْنَةِ الْقَوْمِ' سے مراد لوگوں کے وہ زیورات ہیں جو ان سرداروں کی امانت میں تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سفر کی آپا دھاپی میں ضائع ہونے کے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے قیمتی زیورات بہت سے لوگوں نے ان سرداروں کی امانت میں رکھ دیے تھے اور ان لوگوں نے ایک خدمت سمجھ کر مجبوراً یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ یہ زیورات بنی اسرائیل ہی کے لوگوں کے تھے یا قبطیوں کے؟ اس باب میں تورات کی روایات متضاد ہیں۔ کتاب خروج کے باب ۳۵ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنی اسرائیل ہی کے تھے لیکن اسی کتاب کی دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ملک چھوڑتے وقت سونے چاندی کے بہت سے زیورات اور ظروف مصریوں سے مستعار لیے تھے لیکن یہ دوسری روایت بالکل خلافِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اول تو بنی اسرائیل کو مصر میں یہ حیثیت حاصل نہیں تھی کہ وہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیورات مستعار لے سکیں اور مصری ان کو اپنے قیمتی ظروف تک اٹھا کر ان کو عاریۃً دے دیں بالخصوص ایسے حالات میں جب کہ سالوں سے ان کے اندر ایک شدید کشمکش برپا تھی اور مصری یہ اندیشہ رکھتے تھے کہ بنی اسرائیل ملک چھوڑ کر جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ ثانیاً حضرت موسیٰؑ شرعی اور اخلاقی پہلو سے یہ گوارا کس طرح کر سکتے تھے کہ وہ دوسروں کے عاریت دیے ہوئے مال پر اپنی قوم کو اس طرح قابض ہونے کی اجازت دیں! اس وجہ سے ہمارے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ بنی اسرائیل ہی کے زیورات تھے۔ قرآن میں دوسری جگہ 'مِنْ حُلِيِّهِمْ' کے الفاظ ہیں۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنی اسرائیل ہی کے زیورات تھے۔

'فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ'۔ 'قذف' کے معنی پھینک دینے اور رقم کر دینے کے

ہیں۔ سرداروں نے کہا کہ ہم نے تو لوگوں کا لادا ہوا بوجھ ناخوش گواری کے ساتھ محض لوگوں کی خدمت کے خیال سے اٹھایا تھا۔ لیکن جب ہم مجبور کردیے گئے تو ہم نے اس کو سر سے اتار پھینکا۔ عربی زبان کا ذوق رکھنے والے اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہاں حُمِّلْنَا، اوزار، قذف، تینوں ہی الفاظ اس احساس گراں باری کو ظاہر کر رہے ہیں جوان سرداروں کو اس بار امانت کے سبب سے تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے جب ان کو سرزنش فرمائی تو ان کو خیال ہوا کہ چونکہ یہ بت ان زیورات سے تیار ہوا ہے جو ان کی امانت میں تھے اس وجہ سے ممکن ہے ان کے پیغمبر کو یہ گمان ہو کہ اس سازش میں کچھ ہاتھ ان کا بھی ہے۔ انھوں نے حضرت موسیٰؑ کا یہ شبہ دور کرنے کے لیے اپنی پوزیشن صاف کردی کہ اس فتنہ میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے، البتہ لوگوں کے زیورات کا جو بوجھ ہمارے سر پر لادا گیا تھا وہ ہم نے لوگوں کے مطالبہ سے مجبور ہو کر اپنے سر سے اتار پھینکا کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں کریں۔ ان کے اس قول سے کہ ہم نے یہ جو کچھ کیا اپنے اختیار سے نہیں کیا، یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اپنے امکان کے حد تک انھوں نے سامری کے فتنہ سے لوگوں کو بچانے کی کوشش کی لیکن حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ ان پر قابو پانا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ان کی یہ بےبسی چونکہ واضح تھی اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ان کا عذر قبول فرمالیا۔

لفظ 'القاء' کا مفہوم

'فَکَذٰلِکَ اَلْقَی السَّامِرِیُّ' لفظ 'القاء' عربی میں وسیع معنوں میں آتا ہے۔ یہ جس طرح زمین پر کسی چیز کے ڈال دینے یا پھینک دینے کے معنی میں آتا ہے اسی طرح پانسہ پھینکنے، کوئی ہنر دکھانے یا کوئی کرتب دکھانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ سورۂ حج میں ان شاء اللہ ہم اس کی تحقیق بیان کریں گے۔ یہاں یہ لفظ ہنر اور کرتب دکھانے کے معنی میں ہے۔ اسی سورہ کی آیت ۶۵ میں ہے 'اِمَّآ اَنْ تُلْقِیَ وَاِمَّآ اَنْ نَّکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰی' (ساحروں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ یا تو تم پہلے اپنا کرتب دکھاؤ یا پھر ہم ہی اپنا ہنر دکھاتے ہیں)

سرداروں نے اس فتنہ کی ساری ذمہ داری سامری پر ڈالی کہ ہم نے مجبور ہو کر زیورات کا بوجھ اپنے سر سے اتار دیا اور پھر اس طرح سامری نے اپنا کرتب دکھایا اور ایک بچھڑا بنا کر اس نے پیش کردیا۔

فَاَخْرَجَ لَھُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّہٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا ھٰذَآ اِلٰـھُکُمْ وَاِلٰـہُ مُوْسٰی ۵ فَنَسِیَ (۸۸)

اس طرح سامری نے ڈھال کر ایک بچھڑا برآمد کیا۔ 'جَسَدًا لَّہٗ خُوَارٌ' خوار بچھڑے کے ڈکرنے کی آواز کو کہتے ہیں۔ یعنی اس نے ایک بچھڑے کا دھڑ بنایا جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سامری مصر کے فن بت گری کا ماہر تھا۔ اس زمانہ میں یہ فن مصر میں عروج پر تھا۔ اعراف کی تفسیر میں ہم اس دور کے بعض نوادر کا ذکر کرچکے ہیں۔ ایک ماہر آدمی کے لیے بچھڑے کا ایک ایسا دھڑ بنالینا کچھ مشکل کام نہیں ہے جس میں سے ہوا گزرے تو بچھڑے کی سی آواز نکلے۔ سامری نے اس آواز کو اپنی کرامت کا نتیجہ قرار دیا اور عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے ان کو یہ باور کرایا کہ اس نے اس کے اندر حضرت جبریلؑ کے گھوڑے کی سم کی خاک ڈالی ہے جس سے یہ آواز نکلتی ہے۔ اس قسم کے متصوفانہ ڈھونگ رچانے والے تو آج بھی لوگوں کو بڑی آسانی سے احمق بنالیتے ہیں اور سامری سے کہیں بڑے بڑے سامری ہمارے شہر شہر میں موجود ہیں تو اس زمانہ میں بنی اسرائیل جیسی سادہ لوح

قوم کو کسی سامری کے لیے بے وقوف بنا لینا کیا مشکل کام تھا! چنانچہ جو مفسدین اس فتنہ کے بانی تھے انھوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ دراصل تمھارا اور موسیٰؑ کا معبود تو یہی ہے لیکن موسیٰؑ اس کو نظر انداز کر کے معلوم نہیں کہاں طور پر چلے گئے اور اس کو بھول گئے۔ اس پروپیگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کی عظیم اکثریت اس فتنہ میں پھنس گئی۔

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا (۸۹)

یہ ان سادہ لوحوں کی سادہ لوحی پر اظہار تعجب ہے کہ ان احمقوں نے ذرا نہ سوچا کہ یہ بے جان دھڑ جو نہ ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا اور نہ ان کو کوئی نقصان یا نفع پہنچا سکتا آخر کس مرض کی دوا ہے کہ اس کو معبود بنا بیٹھے! معبود کوئی کھلونا نہیں بلکہ وہ زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ آخر اس سے کون سی ضرورت پوری ہونے والی ہے کہ انھوں نے اس کی عبادت شروع کر دی۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ إِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَأَطِيْعُوْٓا أَمْرِيْ (۹۰)

حضرت ہارونؑ کی فتنہ سے برأت

یہ حضرت ہارونؑ کی اس فتنہ سے برأت کا اظہار ہے۔ تورات میں تو جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، اس سارے فتنہ کی ذمہ داری حضرت ہارونؑ پر ڈال دی گئی ہے لیکن قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں ان کو اس سے بالکل بری قرار دیا ہے۔ مِنْ قَبْلُ کے لفظ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے جوں ہی اس فتنہ کے ابھرنے کے آثار دیکھے اسی وقت سے لوگوں کو آگاہ کرنا شروع کر دیا کہ لوگو، یہ مفسدین تم کو فتنہ میں مبتلا کر رہے ہیں۔ تمھارا معبود خدائے رحمان ہے نہ کہ تمھارے اپنے ہی ہاتھوں کا ڈھالا ہوا کوئی بچھڑا تو میری بات مانو اور ان مفسدین کے پیچھے نہ لگو۔

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوْسٰى (۹۱)

حضرت ہارونؑ نے لوگوں کو آگاہ کرنے کی پوری کوشش کی لیکن ان کی کسی نے ایک نہ سنی۔ لوگوں نے جواب دیا کہ اب تو ہم اس کی پرستش پر حضرت موسیٰؑ کی واپسی تک بہرحال قائم رہیں گے اور دیکھیں گے کہ وہ آ کر کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ اس فقرے سے یہ بات نکلتی ہے کہ لوگ سامری کے چکمے میں آ کر، حضرت ہارونؑ کی تمام کوششوں کے علی الرغم، ایک شدید حماقت تو کر بیٹھے لیکن بعد میں بہت سے لوگوں کو، جیسا کہ سورۂ اعراف سے واضح ہوتا ہے، اپنی اس حماقت کا احساس ہوا۔ مگر ایک حماقت کر گزرنے کے بعد اس سے پیچھا چھڑانا آسان نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ لوگ بھی اس سے فوری دست برداری کا اعلان کرنے کے بجائے مجبور ہوئے کہ حضرت موسیٰؑ کی واپسی تک اسی جہالت پر جمے رہیں۔

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۙ أَلَّا تَتَّبِعَنِ ۖ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِيْ (۹۲-۹۳)

حضرت ہارونؑ سے پرسش

قوم کے سرداروں سے پوچھ گچھ کے بعد حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ کی طرف متوجہ ہوئے جن پر قوم کی دیکھ بھال کی اصل ذمہ داری تھی۔ ان سے پوچھا کہ جب تم نے لوگوں کو گمراہی کی راہ پر جاتے دیکھا تو میری ہدایت کی پیروی کیوں نہ کی، کیا تم نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟ اس حکم سے مراد وہ حکم ہے جو طور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ

اور اپنے متوقع کردہ مائیلٹوں کو دے گئے تھے۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۴۲ کے تحت بھی اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں کہ انھوں نے حضرت ہارونؑ کو ہدایت فرمائی تھی کہ میرے بعد جملہ معاملات میں میری جانشینی کرنا اور قوم کے اندر جو مفسد عناصر ہیں ان سے چوکنے رہنا، ان کو سر اٹھانے کا موقع نہ دینا۔ حضرت موسیٰؑ کے سوال کا انداز ایسا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ گمان نہیں تھا کہ حضرت ہارونؑ نے دیدہ دانستہ ان کے حکم کی نافرمانی کی ہے بلکہ وہ ان کا عذر معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر وہ کیا مجبوری پیش آئی کہ وہ اس فتنہ کا سدباب نہ کر سکے اور اس کو سر اٹھانے کا موقع مل گیا۔

'مَا مَنَعَكَ' کے بعد بظاہر 'اَلَّا تَتَّبِعَنِ' میں 'لا' کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ ہمارے اہلِ نحو اس کو زائد مانتے ہیں۔ لیکن یہ زائد نہیں ہے بلکہ یہ زبان کے معروف استعمال کے مطابق تاکید کے لیے آتا ہے۔ کلامِ عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب موجود ہے۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۚ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي (۹۴)

حضرت ہارونؑ کی معذرت

حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کا سر اور ان کی ڈاڑھی پکڑ کر ان کو جھنجھوڑا کہ تم نے یہ کیا کمزوری دکھائی! حضرت موسیٰؑ کے اس طرزِ عمل سے ان کی حمیتِ حق بھی نمایاں ہو رہی ہے اور وہ محبت بھی جو فطری طور پر ان کو حضرت ہارونؑ سے تھی۔ اس محبت کا تقاضا یہی تھا کہ جب انھوں نے محسوس فرمایا کہ حضرت ہارونؑ سے دین کے معاملے میں کمزوری صادر ہوئی ہے تو وہ جذبات سے مغلوب ہو گئے اور ان کو انھوں نے سختی سے جھنجھوڑا۔ حضراتِ انبیاءؑ اور صالحین کا طریقہ یہی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات میں تو رواداری برتتے ہیں لیکن دین کے معاملات میں وہ مداہنت نہیں برتتے۔ اس معاملے میں جو ان سے جتنا ہی قریب ہوتا ہے وہ اس کے لیے اتنے ہی زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ اہلِ دنیا کی روش اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ اپنی دنیا کے معاملات میں تو بڑے چوکنے اور زیرک ہوتے ہیں، اپنے باپ اور بیٹے کا بھی محاسبہ کرتے ہیں لیکن دین کے معاملے میں بالکل بے حمیت اور بے حس ہوتے ہیں۔ بھائی بند جو چاہیں کرتے پھریں ان کی غیرت کو ذرا بھی حرکت نہیں ہوتی!

حضرت ہارونؑ نے اپنی معذرت پیش کی اور اندازِ خطاب بہت ہی پیارا ہے۔ فرمایا، اے میرے ماں جائے! میری ڈاڑھی اور میرا سر نہ پکڑیے، مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں نے کوئی سخت قدم اٹھایا تو بنی اسرائیل کے درمیان تفریق ہو جائے گی اور پھر آپ کہیں گے کہ میں نے آپ کی نصیحت پر عمل نہیں کیا اور ملت کے اندر تفریق برپا کر دی۔ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ حضرت ہارونؑ نے لوگوں کو اس فتنہ سے روکنے کی انتہائی کوشش کی لیکن ایک عظیم اکثریت پر سامری کا جادو اس طرح چل چکا تھا کہ لوگوں کو روکنا تو در کنار الٹا اندیشہ اس بات کا پیدا ہو گیا تھا کہ مبادا اشرار حضرت ہارونؑ کو قتل کر دیں۔ اب دو ہی صورتیں باقی رہ گئی تھیں۔ یا تو حضرت ہارونؑ اپنے ساتھیوں کو لے کر الگ ہو جائیں یا چند دن حضرت موسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کریں۔ پہلی صورت میں اندیشہ

تفریقِ ملت، اور باہمی کشت و خون کا تھا۔ دوسری صورت میں توقع تھی کہ حضرت موسیٰؑ اپنے دبدبہ اور حسنِ تدبیر سے حالات پر قابو پالیں گے۔ اسی توقع کی بنا پر انھوں نے پہلی صورت اختیار نہ کی کہ اس سے اصلاح کی جگہ فساد کا اندیشہ تھا اور وہ حتی الامکان اس فساد سے قوم کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ (۹۵)

سامری سے بازپرس

تمام ذمہ داروں سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد جب بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی کہ دراصل اس سارے فساد کا بانی سامری ہی ہے تو حضرت موسیٰؑ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت تیکھے انداز میں اس سے سوال کیا کہ سامری! تو بتا، یہ تو نے کیا کیا؛ یہ کیا ماجرا ہے؛ یہ کیا فتنہ کھڑا کر دیا!

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ (۹۶)

سامری کا ڈھونگ

سامری نے جب دیکھا کہ اب وہ حضرت موسیٰؑ کی گرفت میں آچکا ہے تو اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ ایک بات بنائی جس میں اس نے ایک طرف تو اپنے اس فعل کے لیے ایک وجہ بھی بیان کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اس امر کا اعتراف بھی کر لیا کہ اب مجھ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ جو کچھ بھی میں نے سمجھا تھا یہ محض فریبِ نفس تھا اور میں غلط فہمی کے سبب سے نفس کے فریب کو ایک حقیقت سمجھ بیٹھا۔

بات تو اس نے یہ بنائی کہ مجھے ایک کشفی مشاہدہ ہوا جو صرف مجھی کو ہوا دوسروں کو نہیں ہوا۔ وہ یہ کہ میں نے دیکھا کہ حضرت جبریلؑ آئے ہیں اور میں نے ان کے نقشِ قدم (یا ان کے گھوڑے کے نقشِ قدم) سے ایک مٹھی خاک اٹھالی ہے اور ایک بچھڑا بنا کر اس کے اندر ڈال دی ہے جس سے وہ بولنے لگا لیکن اب آپ کی اس تنبیہ کے بعد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ یہ کوئی کشف کا مشاہدہ نہیں تھا بلکہ یہ محض میرے نفس کا ایک دھوکا تھا جس میں مبتلا ہو کر میں یہ جرم کر بیٹھا۔ سامری نے اس طرح حضرت موسیٰؑ کے سامنے اپنے آپ کو معذور ٹھہرانے کی کوشش کی کہ اس نے یہ جو کچھ کیا ایک کشف کے زیرِ اثر کیا، بطورِ خود کسی شرارت کے ارادے سے نہیں کیا؛ لیکن اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اب حضرت موسیٰؑ کی گرفت سے اس کے لیے چھوٹنا آسان نہیں ہے اور اس قسم کی دھونس ان کے آگے چلنے والی نہیں ہے اس وجہ سے اس نے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ یہ جو کچھ ہوا محض مغالطہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنے نفس کے ایک فریب کو ایک کشف سمجھ بیٹھا اور مجھ سے یہ جرم صادر ہو گیا۔

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۠ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا (۹۷)

سامری پر لعنت

اس کے اس عذر سے حضرت موسیٰؑ پر اس کی مکاری اور شرارت اچھی طرح واضح ہو گئی۔ انھوں نے اس کے اوپر لعنت کر دی اور عمر بھر کے لیے اس کو یہ سزا دی کہ اب تو یہ کہتا پھرے گا کہ لوگو، میں ناپاک ہوں، نہ کوئی مجھے ہاتھ لگائے اور نہ میں کسی کو ہاتھ لگا سکتا ہوں اور ساتھ ہی اس کو آخرت کے عذاب کی بھی خبر دے دی

کہ ایک عذاب موعود کا دن بھی تیرے لیے آنے والا ہے جس سے تو کسی طرح بھی اپنے کو بچا نہ سکے گا۔ وہ بہرحال شدنی ہے۔

'فَاذْهَبْ' یعنی دور دفع ہو۔ یہ یہاں دھتکارنے کے معنی میں آیا ہے ۔

'فِي الْحَيٰوةِ' یعنی تیرے لیے یہ لعنت کی سزا وقتی اور عارضی نہیں ہے بلکہ عمر بھر کے لیے یہ تیرے اوپر مسلط کر دی گئی۔

'لَا مِسَاسَ' کا مفہوم

'اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ' یعنی تو خود اپنی زبان سے پکارتا پھرے گا کہ میں ناپاک ہوں، نہ مجھے کوئی چھوئے نہ میں کسی کو چھونے کا مجاز ہوں۔

حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں جماعت سے کسی شخص کو کاٹ دینے کی سزا موجود ہے۔ احبار باب ۷ آیت ۲۱ میں بعض چیزوں کی حرمت بیان کرنے کے بعد ان کے مرتکب کے لیے یہ سزا بیان ہوئی ہے۔

"وہ کھانے والا آدمی اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے"

جس شخص کو یہ سزا دی جاتی وہ بالکل اچھوت بن کر رہ جاتا۔ نہ اس کی شادی غمی میں کوئی شریک ہوتا، نہ اس کو عبادت خانہ میں جانے کی اجازت ہوتی اور نہ کوئی اس کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیتا۔

اس سے زیادہ سخت سزا کوڑھیوں کے لیے بیان ہوئی ہے۔ احبار کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"اور جو کوڑھی اس بلا میں مبتلا ہو اس کے کپڑے پھٹے اور اس کے سر کے بال بکھرے رہیں اور وہ اپنے اوپر کے ہونٹ کو ڈھانکے اور چلا چلا کر کہے ناپاک ناپاک۔ جتنے دنوں تک وہ اس بلا میں مبتلا رہے وہ ناپاک رہے گا۔ اور وہ ہے بھی ناپاک۔ پس وہ اکیلا رہا کرے۔ اس کا مکان لشکر گاہ کے باہر ہو۔ (احبار ۱۳: ۴۵-۴۶)

یہی سزا حضرت موسیٰؑ نے سامری کو دی۔ بس یہ فرق ہے کہ کوڑھی کے لیے یہ سزا صرف اس وقت تک کے لیے تھی جب تک وہ اس مرض میں مبتلا رہے لیکن سامری کو حضرت موسیٰؑ نے یہ سزا عمر بھر کے لیے دی اس لیے کہ وہ منافقت کے کوڑھ میں مبتلا تھا جو ایک اخلاقی اور روحانی کوڑھ جسمانی کوڑھ سے زیادہ غلیظ ہے۔ مزید برآں اس پر حضرت موسیٰؑ نے لعنت بھی کر دی جو دین میں سخت ترین سزا ہے۔ قرآن کے الفاظ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ اور تورات کے الفاظ "اور چلا چلا کر کہے ناپاک ناپاک" ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کر دیکھیے تب قرآن کے الفاظ کا اصل مقام و محل اور اس کا اصلی زور سمجھ میں آئے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ کسی کا خود اپنے ناپاک ہونے کا چلا چلا کر اعلان کرنا اس کی ذلت و رذالت کی آخری حد ہے!

سامری کے معبود کا حشر

'وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ۔ الاٰیۃ' ساتھ ہی حضرت موسیٰؑ نے اس کے ڈھالے ہوئے معبود کے متعلق بھی فرمایا کہ دیکھ تیری آنکھوں کے سامنے ہم اس کو جلائیں گے اور اس کو راکھ بنا کر سمندر میں بکھیر دیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے یہ اقدام اس لیے فرمایا کہ شرک کے ساتھ آثار شرک کا مٹانا ضروری ہوتا ہے تاکہ شرک کے تمام جراثیم کا یک قلم خاتمہ ہو جائے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فتح مکہ کے موقع پر تمام بتوں کا یک قلم خاتمہ

کرا دیا تھا۔

یہاں ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ حضرت موسیٰؑ نے سامری کو قتل کی سزا کیوں نہ دی جب کہ اسی جرم کے بہت سے مرتکبین کو جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکا ہے، انھوں نے قتل کرا دیا، ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لعنت، جیسا کہ ہم اصحاب سبت کے سلسلہ میں ذکر کر چکے ہیں، قتل سے زیادہ سنگین اور عبرت انگیز سزا ہے۔ قتل کی سزا تو آناً فاناً ختم ہو جاتی ہے اور اس سے دوسروں کو جو عبرت ہوتی ہے وہ بھی وقتی ہوتی ہے لیکن یہ لعنت کی سزا دنیا اور آخرت دونوں میں آدمی کے ساتھ چپک کے رہ جاتی ہے۔ تصور کیجیے اس انسان کی شومئی قسمت کا جو زندگی بھر خود اپنی زبان سے یہ منادی کرتا پھرے کہ لوگو، میں ناپاک ہوں، کوئی مجھے ہاتھ نہ لگائے! یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ پیغمبر کی لعنت ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی کہیں بھاگ کر چھوٹ سکے۔ پیغمبر کا لعنت کیا ہوا جہاں کہیں بھی جاتا ہے لعنتی ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی!

تورات کی ایک دلچسپ روایت

اس بت سے متعلق قرآن کا ارشاد تو یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کو جلا کر اور کوٹ پیس کر اس کی راکھ سمندر میں بکھیر دی لیکن تورات میں یہ دلچسپ روایت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کی راکھ پانی میں گھول کر لوگوں کو پلا دی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تورات کے راویوں کو روایت گھڑنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے! آخر یہ کون سا شربت روح افزا تھا جو حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو پلانے کے لیے یہ اہتمام فرماتے! اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شاید اسی کا فیض ہے کہ حامل کتاب ہونے کے باوجود شرک اس بدقسمت قوم کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے، جس سے نہ کبھی اس کو نجات ملی اور نہ شاید کبھی ملے گی!

اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ وَسِعَ كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا (۹۸)

یعنی اس بچھڑے کو جن لوگوں نے معبود بنایا انھوں نے اپنی شامت بلائی۔ تمھارا معبود یہ بچھڑا نہیں بلکہ صرف وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وَسِعَ كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا توحید کی دلیل ہے کہ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے، کوئی چیز بھی اس کے دائرۂ علم سے خارج نہیں ہے تو وہ اپنا کسی کو شریک کیوں بنائے اور دوسرے اس کا کسی کو شریک کیوں قرار دیں۔ جب وہ سب کچھ سنتا جانتا ہے تو وہ تنہا کافی ہے۔ کسی اور کی احتیاج کہاں باقی رہی۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹۹-۱۳۵

حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت تمام ہوئی۔ اب آگے وہی مضمون جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا نئے اسلوب اور نئے دلائل کے ساتھ پھر سامنے آ گیا۔ آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ماضی کی یہ سرگزشت جو ہم نے تمھیں سنائی ہے یہ صرف ماضی کی حکایت نہیں ہے بلکہ یہی کچھ تمھارے اور تمھارے مخالفین کے سامنے بھی پیش آ رہا ہے اور پیش آئے گا۔ جو لوگ تمھاری اس یاددہانی سے اعراض اور دوسروں کو برگشتہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ قیامت کے روز اپنا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی ان کو اٹھانا پڑے گا جو ان کے

سبب سے گمراہ ہوں گے۔ اور یہ قیامت کا دن بڑا ہی سخت دن ہوگا۔ اس دن کسی کی کچھ پیش نہیں جائے گی۔ سب کی پیشی خدا ہی کے سامنے ہوگی اور اس کے سامنے کوئی اس کے اذن کے بغیر کسی کی سفارش کے لیے زبان نہ کھول سکے گا۔ تو ہم نے جو یاد دہانی تم پر اتاری ہے اس کے اندر ہر خطرے سے لوگوں کو آگاہ کر دیا ہے۔ تم اس کو لوگوں کو سنا دو۔ جس کو توفیق ہوگی وہ اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ جو اس سے اعراض کرتا ہے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔

اس کی کوئی ذمہ داری تمھارے اوپر نہیں ہے اور یہ قرآن جس تدریج کے ساتھ اتر رہا ہے اسی تدریج کے ساتھ تم اس کو لوگوں کو سناؤ۔ اسی تدریج و ترتیب میں حکمت ہے۔ اس کے لیے جلدی نہ کرو۔ جلدی میں خیر و برکت نہیں ہے۔ آدمؑ نے جلدی کی تو اس کا نتیجہ اس شکل میں ان کے سامنے آیا کہ شیطان نے ان کو جنت سے نکلوا چھوڑا۔

جو لوگ تم سے نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کو خود ان کے ملک کی تاریخ کی طرف توجہ دلاؤ۔ اور ان کے طعن و طنز پر صبر کرو اور اس صبر کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ نماز کا اہتمام کرو۔ امراء و اغنیاء کے ایمان کے لیے بھی تمھیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ تم ان کے مال و اسباب کے محتاج ہو اور نہ تمھاری یہ دعوت ان کی سرپرستی کی محتاج ہے۔ تمھارا اور تمھارے ساتھیوں کا کفیل اور سرپرست اللہ ہے۔ جو لوگ تم سے کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ سب سے بڑی نشانی تمھارے پاس قرآن کی صورت میں آگئی ہے اور یہ اسی لیے آئی ہے کہ تم پر حجت تمام ہو جائے۔ اگر تم لوگ اس کو کافی نہیں سمجھتے، کسی عذاب ہی کے طالب ہو تو اس کے لیے تم بھی انتظار کرو، میں بھی اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۹-۱۳۵

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ
لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾
خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ
وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ
لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ
طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ
يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا
عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ

ع ۵
۱۴

خَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا ﴿١٠٨﴾ يَوْمَئِذٍ
لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾
يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ
عِلْمًا ﴿١١٠﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ
ظُلْمًا ﴿١١١﴾ وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ
ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿١١٢﴾ وَكَذٰلِكَ أَنزَلْنٰهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَّ
صَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ
ذِكْرًا ﴿١١٣﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِن
قَبْلِ أَن يُّقْضٰى إِلَيْكَ وَحْيُهُ ۖ وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا ﴿١١٤﴾ وَلَقَدْ
عَهِدْنَا إِلٰى آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ﴿١١٥﴾ وَإِذْ قُلْنَا
لِلْمَلٰئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبٰى ﴿١١٦﴾ فَقُلْنَا
يَا آدَمُ إِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ
فَتَشْقٰى ﴿١١٧﴾ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿١١٨﴾ وَأَنَّكَ لَا
تَظْمَؤُا فِيهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿١١٩﴾ فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يَا آدَمُ
هَلْ أَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿١٢٠﴾ فَأَكَلَا
مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِن
وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۚ وَعَصٰى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوٰى ﴿١٢١﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهُ
فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿١٢٢﴾ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ

ع ٦ ١١ ١٥

عَدُوٌّ ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ
وَلَا يَشْقٰى ﴿١٢٣﴾ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ
نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَعْمٰى ﴿١٢٤﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ أَعْمٰى
وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿١٢٥﴾ قَالَ كَذٰلِكَ أَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَ
كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿١٢٦﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ أَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ
بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقٰى ﴿١٢٧﴾ أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ
كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي النُّهٰى ﴿١٢٨﴾ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا
وَّأَجَلٌ مُّسَمًّى ۭ ﴿١٢٩﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ
طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ
لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿١٣٠﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ أَزْوَاجًا
مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ
خَيْرٌ وَّأَبْقٰى ﴿١٣١﴾ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۭ لَا
نَسْئَلُكَ رِزْقًا ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿١٣٢﴾ وَقَالُوْا
لَوْلَا يَأْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ أَوَلَمْ تَأْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ
الْأُوْلٰى ﴿١٣٣﴾ وَلَوْ أَنَّآ أَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا
لَوْلَآ أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَّذِلَّ وَ
نَخْزٰى ﴿١٣٤﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ أَصْحٰبُ

ع ١٣
١٦

الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾ ع ۸ / ۱۷

ترجمہ آیات ۹۹-۱۳۵

اسی طرح ہم تمہیں ماضی کی سرگزشتیں بھی سناتے ہیں اور خاص اپنے پاس سے تمہیں بھی یاددہانی عطا کی ہے۔ جو اس سے اعراض کریں گے وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔ اسی کے تلے ہمیشہ رہیں گے اور قیامت کے دن یہ بہت بھاری بوجھ ہوگا! جس دن صور پھونکا جائے گا اور مجرموں کو اس دن ہم اس حال میں اکٹھا کریں گے کہ خوف کے مارے ان کی آنکھیں نیلی پڑی ہوں گی۔ وہ آپس میں چپکے چپکے کہتے ہوں گے کہ بس تم دس دن رہے ہوگے! ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ وہ کہیں گے جب کہ ان میں جو سب سے بڑا لال بجھکڑ ہوگا کہے گا کہ بس زیادہ سے زیادہ ایک دن تم ٹھہرے ہوگے۔ ۹۹-۱۰۴

اور وہ تم سے پہاڑوں کی بابت سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ میرا رب ان کو گرد و غبار کی طرح اڑا دے گا اور زمین کو بالکل صفاچٹ چھوڑ دے گا۔ نہ تم اس میں کوئی کجی دیکھو گے اور نہ کوئی بلندی۔ اس دن سب پکارنے والے کے پیچھے چل پڑیں گے۔ مجال نہیں کہ ذرا اس سے کج ہو سکیں اور ساری آوازیں خدائے رحمان کے آگے پست ہو جائیں گی، بس تم صرف کانا پھوسی ہی سنو گے۔ اس دن شفاعت نفع نہ دے گی اِلّا آنکہ خدائے رحمان جس کو اجازت دے اور جس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے۔ وہ ان کے آگے اور ان کے پیچھے جو کچھ ہے سب سے باخبر ہے اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ سب کے چہرے خدائے حی و قیوم کے حضور جھکے ہوئے ہوں گے اور جو کسی شرک کا مرتکب ہوا وہ نامراد ہوا۔ اور جو نیک اعمال کرے گا اور وہ مومن بھی ہے تو اس کو نہ کسی حق تلفی کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی زیادتی کا۔ ۱۰۵-۱۱۲

اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن کی صورت میں اتارا اور اس میں ہم نے اپنی وعید گوناگوں پہلوؤں سے واضح کر دی ہے تاکہ یہ لوگ خدا کے غضب سے بچیں یا یہ ان کے اندر کچھ سوجھ بوجھ پیدا کرے۔ پس اللہ بادشاہ حقیقی بہت برتر ہے۔ پس تم قرآن کے لیے، اپنی طرف اس کی وحی پوری کیے جانے

سے پہلے، جلدی نہ کرو، اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب میرے علم میں افزونی فرما۔ ۱۱۳-۱۱۴

اور ہم نے اس سے پہلے آدم پر ایک عہد کی ذمہ داری ڈالی تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم کی پختگی نہیں پائی اور جب کہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے۔ اس نے انکار کر دیا۔ تو ہم نے کہا کہ اے آدم، یہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے تو تم کو کہیں جنت سے نکال نہ چھوڑے کہ تم محروم ہو کر رہ جاؤ۔ اس میں تم کو یہ مقام حاصل ہے کہ تم اس میں نہ بھوکے رہو گے اور نہ ننگے۔ اور نہ تم کو پیاس ستائے گی اور نہ دھوپ لگے گی۔ تو شیطان نے اس کو ورغلایا، کہا کہ اے آدم، کیا میں تمھیں زندگی دوام کے درخت اور ایسی بادشاہی کا سراغ دوں جس پر کبھی کہنگی نہ آئے! تو ان دونوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا تو ان کے ڈھانکنے کی چیزیں عریاں ہو گئیں اور وہ اپنے اوپر باغ کے پتے گانٹھنے گونتھنے لگے اور آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی تو بھٹک گئے۔ پھر اس کے رب نے اس کو نوازا، اس کی توبہ قبول کی اور اس کو ہدایت بخشی۔ حکم ہوا کہ تم سب یہاں سے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ پس اگر تمھارے پاس میری ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا، نہ وہ گمراہ ہوگا اور نہ محروم رہے گا۔ اور جو میری یاد دہانی سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے ضیق کی زندگی ہوگی اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا اے رب تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا، میں تو بینا تھا! ارشاد ہوگا، اسی طرح دنیا میں ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو نظر انداز کیا تو اسی طرح تو آج نظر انداز کیا جائے گا اور اسی طرح ہم بدلہ دیں گے اس کو جو حدود سے تجاوز کرے گا اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہیں لائے گا اور عذابِ آخرت زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہوگا۔ ۱۱۵-۱۲۷

کیا ان کے لیے یہ چیز ہدایت دینے والی نہ بنی کہ کتنی ہی قوموں کو ان سے پہلے ہم نے ہلاک کر

دیا جن کی بستیوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں بے شک اس کے اندر اہل عقل کے لیے بڑی بڑی نشانیاں ہیں! اور اگر تمھارے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی اور ایک اجل معیّن مقرر نہ ہو چکی ہوتی تو عذاب مسلط ہو کے رہتا۔ تو جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی، اس کی حمد کے ساتھ، تسبیح کرو سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور ان کے اطراف میں بھی تاکہ تم نہال ہو جاؤ۔ اور ان کی بعض جماعتوں کو آسائش زندگی کی جس رونق سے ہم نے ان کی آزمائش کے لیے بہرہ مند کر رکھا ہے اس کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ اور تمھارے رب کا رزق بہتر اور پائدار ہے۔ اور اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو۔ ہم تم سے رزق کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ہم تم کو رزق دیں گے اور انجام کار کی فیروز مندی تقویٰ کے لیے ہے۔ ۱۲۸-۱۳۲

اور یہ کہتے ہیں کہ یہ اپنے رب کے پاس سے ہمارے لیے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے! کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں میں جو کچھ مذکور ہے اس کی دلیل نہیں پہنچی! اور اگر ہم ان کو اس سے پہلے ہی کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو یہ کہتے کہ اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیری ہدایات کی پیروی کرتے! کہہ دو، ہر ایک منتظر ہے تو تم بھی انتظار کرو۔ تم عنقریب جان لو گے کہ سیدھی راہ والے کون ہیں اور منزل پر کون پہنچے۔ ۱۳۳-۱۳۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا (۹۹)

ماضی اور مستقبل دونوں کا آئینہ

كَذٰلِكَ کا اشارہ حضرت موسیٰؑ کی اسی سرگزشت کی طرف ہے جو پیچھے گزری۔ اب یہ آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ہم تمھیں ماضی کی یہ اہم سرگزشتیں بھی سنا رہے ہیں اور خاص اپنے پاس سے تمھیں بھی کتاب عطا فرمائی ہے۔ یعنی ماضی میں خدا نے اپنے رسولوں اور ان کے مخالفوں کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ بھی تمھیں سنا دیا ہے اور تمھارے ان مخالفوں کے ساتھ جو معاملہ کرنے والا ہے وہ بھی تمھیں بتا دیا ہے۔ اب اسی آئینے میں اپنا اور اپنے ان

حرلفیوں کا مستقبل دیکھ لو۔ ذکر سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے پچھلے انبیاء اور ان کی تعلیمات کا وہ حصہ بھی محفوظ کر دیا ہے جس کو محفوظ رکھنا تھا اور آخری رسول کی حیثیت سے جو ہدایت آنحضرتؐ پر نازل ہونے والی تھی وہ بھی اس میں ہے۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًاۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا (۱۰۰ - ۱۰۱)

مخالفین کو دھمکی

یہ دھمکی ہے ان لوگوں کو جو اس یاددہانی سے اعراض کریں گے۔ فرمایا کہ جو اس سے اعراض کریں گے وہ قیامت کے روز ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔ ان کے اوپر اپنی گمراہی کا بوجھ بھی ہوگا اور جو لوگ ان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوں گے ان کے بوجھ میں سے بھی ان کو اٹھانا پڑے گا۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ میں ضمیر لفظ 'وزر' کے لازم کے اعتبار سے آئی ہے۔ چونکہ 'وزر' سے مراد اس کا لازمی نتیجہ یعنی عذاب ہے اس وجہ سے فرمایا کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اس بوجھ کی نسبت فرمایا کہ نہایت ہی برا بوجھ ہوگا اس لیے کہ نہ تو اس سے کبھی نجات حاصل ہو سکے گی اور نہ کوئی اس کے اٹھانے میں معین و مددگار ہوگا۔ ہر ایک کو یہ بوجھ خود ہی اٹھانا پڑے گا۔

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا (۱۰۲)

'زرق' 'ازرق' کی جمع ہے۔ 'ازرق' نیلگوں چشم کو کہتے ہیں لیکن عربی محاورہ میں یہ خوف زدہ اور دہشت زدہ آدمی کے لیے بھی آتا ہے اس لیے کہ شدتِ خوف کی حالت میں آنکھیں نیلی پڑ جایا کرتی ہیں اور ان کے سرخ ڈورے غائب ہو جاتے ہیں۔

اوپر والی آیت میں جس قیامت کا ذکر ہے یہ اس کی تصویر ہے کہ اس دن کو یاد کرو جس دن صور پھونکا جائے گا۔ یہ مجہول کا صیغہ اس کی ہولناکی کی تعبیر کے لیے ہے کہ ایک ہولناک آواز ایک ہلچل تو برپا کر دے گی لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ فرمایا کہ اس دن ہم ان تمام مجرموں کو جو ہماری اس یاددہانی سے برگشتہ ہیں اور دوسروں کو بھی برگشتہ کر رہے ہیں اکٹھا کریں گے اور آج تو وہ بڑی ڈھٹائی سے ہماری تنبیہ کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن اس دن سب کی آنکھیں خوف سے نیلی پڑی ہوں گی۔

يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا (۱۰۳)

ایک مغالطہ کا ازالہ

یعنی آج تو یہ قیامت سے بالکل نچنت اور بے خوف ہیں۔ اول تو اس کو بہت بعید از امکان چیز سمجھتے ہیں اور اگر کسی درجے میں اس کو مانتے بھی ہیں تو یہ خیال کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں کہ زندگی، پھر موت، پھر برزخ پھر قیامت یہ اتنی دور کی بات ہے کہ اس کی فکر میں ابھی سے اپنے عیش کو مکدر کرنا حماقت ہے۔ فرمایا کہ آج تو یہ اس کو بہت دور کی چیز سمجھتے ہیں لیکن جب وہ آن کھڑی ہوگی تو آپس میں ایک دوسرے سے سرگوشی کریں گے اور کہیں گے کہ ان سارے مراحل پر زیادہ سے زیادہ بس دس دن گزرے ہوں گے! یہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ برزخی زندگی کا قیامت کے دن کوئی احساس نہیں ہوگا، ایسا معلوم ہوگا کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے

ہیں۔ رہی یہ دنیا کی زندگی تو جب تک یہ ہے اس وقت تک تو آدمی اسی مغالطہ میں رہتا ہے کہ ابھی بہت عمر باقی ہے لیکن جب وقت آخر آ جاتا ہے تب محسوس ہوتا ہے کہ جس چیز کو بہت طویل سمجھے تھے وہ بہت مختصر نکلی۔ خاص طور پر غفلت میں جو زندگی گزرتی ہے وہ آنکھ کھلنے کے بعد بس ایک خواب معلوم ہوتی ہے۔ قرآن نے اسی غفلت پر یہاں متنبہ کیا ہے کہ اصل اعتبار آج کے احساس کا نہیں کہ یہ تو یکسر مغالطہ ہے بلکہ اس احساس کا ہے جو حقیقت کے سامنے آنے کے بعد ہوگا۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا (۱۰۴)

یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم اس دن کے احوال و احساسات کی یہ خبر جو دے رہے ہیں یہ محض ہوائی باتیں ہیں جو صرف مرعوب کرنے کے لیے سنائی جا رہی ہیں بلکہ یہ حقائق ہیں جو پیش آئیں گے۔ اس دن لوگ جو کچھ کہیں گے ان سے سب سے زیادہ واقف ہم ہیں۔ یہ دس دن والی بات تو الگ رہی اس دن ان کے اندر جو سب سے زیادہ معقول دانشمند اور اندازہ دان سمجھا جاتا ہوگا وہ یہ کہے گا کہ دس دن کہاں! بس زیادہ سے زیادہ ایک دن تم دنیا میں رہے ہوگے!

'امثل' کے معنی

'امثل' کے معنی افضل و برتر کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ بطریق تعریض استعمال ہوا ہے یعنی ان کے اندر جو سب سے زیادہ لال بجھکڑ مانا جاتا ہوگا وہ اپنی اندازہ دانی کا یہ ثبوت فراہم کرے گا!!

عرب جاہلیت کی شاعری پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ ان آیتوں میں جس مغالطہ پر متنبہ کیا گیا ہے اسی مغالطہ میں مبتلا ہو کر بہت سے شاعروں نے قیامت کو 'حدیث خرافہ' یعنی ایک مہمل بات قرار دیا ہے۔ میں ان شعروں کے نقل کرنے سے قصداً احتراز کر رہا ہوں اور ان کے نقل کرنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہے اس لیے کہ یہ مغالطہ صرف دورِ جاہلیت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس دورِ تمدن کے لوگوں کا بھی اصل مغالطہ یہی ہے۔ قرآن نے یہاں اسی مغالطہ پر متنبہ کیا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۝ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا (۱۰۵-۱۰۷)

'نسف' کے معنی

'نسف' کے معنی ہیں کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینا، غلہ کو چھاج میں رکھ کے پھٹکنا، کسی چیز کو خس و خاشاک اور خاک اور راکھ بنا کر ہوا میں اڑا دینا۔

'یذرھا' میں ضمیر کا مرجع زمین ہے۔ ظاہر اور مشہور چیزوں کے لیے عربی میں اس طرح ضمیر لاتے ہیں۔ قرآن میں آسمان اور زمین وغیرہ کے لیے اس طرح متعدد جگہ ضمیریں آئی ہیں 'مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ' (اور روئے زمین پر کسی جاندار کو باقی نہیں چھوڑے گا) میں بھی ضمیر کا مرجع زمین ہے اگرچہ الفاظ میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

'قاع صفصف' کا مفہوم

'قاع صفصف' ہموار اور چٹیل میدان کو کہتے ہیں جس میں نہ نشیب و فراز ہو، نہ سبزہ و نباتات، نہ

درخت اور جنگل۔

'امت' بلندی اور فراز کو کہتے ہیں۔

پہاڑوں کے غیر فانی ہونے کا نظریہ اور اس کا ابطال

قیامت کے باب میں اہل عرب کو جس طرح وہ مغالطہ تھا جو اوپر مذکور ہوا اسی طرح وہ اس مغالطہ میں بھی مبتلا تھے کہ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ کسی دن روئے زمین سے یہ تمام پہاڑ غائب ہو جائیں۔ عوام تو در کنار ان کے بہت سے دانشوروں تک کا خیال یہ تھا کہ پہاڑ غیر فانی ہیں۔ زہیر جو عرب کے حکیم شعراء میں سے ہے، کہتا ہے کہ

الا ارٰی علی الحوادث باقیا

ولا خالدا الا الجبال الرواسیا

(حوادث روزگار کے مقابل میں ان مستحکم پہاڑوں کے سوا میں اور کسی چیز کو بھی قائم و دائم رہنے والی خیال نہیں کرتا)

جب قرآن لوگوں کو قیامت کے زلزلہ سے ڈراتا تو اسی مغالطہ کی بنا پر بہت سے نادان آنحضرت صلعم سے طنز اور مذاق کے انداز میں، سوال کرتے کہ جب قیامت آئے گی تو ان عظیم الشان پہاڑوں کا کیا بنے گا؟ کیا وہ ان کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکے گی! فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ ہاں! میرا رب ان کو بھی پاش پاش کر کے گرد و غبار کی طرح اڑا دے گا اور اس زمین کو بالکل صفاچٹ چھوڑ دے گا، نہ اس میں کسی سبزہ اور درخت کا نشان ہو گا اور نہ اس میں وادیاں اور کہسار اور نشیب و فراز ہوں گے!!

عرب جاہلیت تو پہاڑوں کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے اس لیے کہ ان کے نزدیک پہاڑ ہی بڑی چیز تھے لیکن اس زمانے کا انسان خود اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھتا ہے اور اس زعم میں مبتلا ہے کہ وہ بہت جلد ساری کائنات کو مسخر کرے گا۔ اس زعم کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ اس کے نزدیک قیامت کا سوال بالکل خارج از بحث ہے!!

يَوْمَئِذٍ يَتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا (۱۰۸)

'ھمس' کے معنی باریک اور پست آواز کے ہیں جو کانا پھوسی کی نوعیت کی ہو۔

فرمایا کہ آج تو لوگ ہمارے داعی کی بات نہیں سن رہے ہیں، وہ صراط مستقیم کی دعوت دے رہا ہے تو یہ کج ہو کے چل رہے ہیں، اس کی مخالفت میں گلے پھاڑ رہے ہیں۔ لیکن اس دن کا داعی جب پکارے گا تو سب اس کے پیچھے چل پڑیں گے، کسی کی مجال نہ ہو گی کہ سر مو اس سے انحراف کر سکے اور خدائے رحمان کی ہیبت کے آگے سب کی آوازیں پست ہو جائیں گی، کسی کے حلق سے بھی آواز نہیں نکلے گی۔ جو بھی بات کرے گا سرگوشی اور کانا پھوسی کے انداز میں بات کرے گا۔

شفاعت کے لیے شرائط

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا (۱۰۹)

'استثناء' میرے نزدیک یہاں منقطع ہے۔ یہ عربوں کی مزعومہ شفاعت کی تردید ہے۔ ان کا زعم یہ تھا کہ وہ جن معبودوں کو پوجتے ہیں وہ خدا کے لاڈلے اور چہیتے ہیں، وہ خود آگے بڑھ کر اپنے پجاریوں میں سے جس کے لیے چاہیں گے

سفارش کریں گے اور اس کو خدا سے چھڑا لیں گے۔ ان کے اس زعم کی تردید میں فرمایا کہ اس دن کسی کی شفاعت کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں ہے الا آنکہ خدا نے رحمان کسی کو شفاعت کی اجازت دے اور کسی کے بارے میں وہ کسی کے کچھ کہنے کو پسند فرمائے۔ یعنی جو شفاعت کرے گا وہ بھی خدا کی اجازت سے کرے گا اور جس کے لیے شفاعت کی جائے گی وہ بھی بایں شرط مشروط ہے کہ خدا اس کے بارے میں کسی کے سفارش کرنے کو پسند فرمائے۔ مطلب یہ ہے کہ کام آنے والی شفاعت بیک وقت ان دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر کسی نے شفاعت سے متعلق ان شرائط سے قطع نظر کر کے کوئی اپنا نظریہ ایجاد کر رکھا ہے تو وہ محض اس کا واہمہ ہے جس کی حقیقت قیامت کے دن اس کے سامنے آجائے گی۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۲۸ کے تحت انشاء اللہ اس مضمون کی مزید وضاحت آئے گی۔

یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَمَا خَلۡفَہُمۡ وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِہٖ عِلۡمًا (۱۱۰)

اس ٹکڑے کی شرح آیت الکرسی کے تحت وضاحت سے ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کا علم سب کو محیط ہے۔ ہر ایک کے ماضی و مستقبل اور حاضر و غائب سب سے وہ واقف ہے۔ دوسرے کسی کی یہ حیثیت نہیں کہ اس کا علم خدا کے علم کا احاطہ کر سکے تو یہ مقام کس کا ہے کہ وہ کسی کے باب میں خدا کے علم میں کوئی اضافہ اور اس بنیاد پر اس کے حق میں کوئی سفارش کر سکے! خدا کسی کے متعلق کسی سے یہ معلوم کرنے کا محتاج نہیں ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے، اس کے اعمال کیا رہے ہیں اور وہ کیا معاملہ کیے جانے کا مستحق ہے؟ یہ ساری چیزیں اس کے علم میں موجود ہیں۔ اس مسئلے پر سورۂ مریم کی آیت ۸۷ کے تحت جو بحث گزر چکی ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَعَنَتِ الۡوُجُوۡہُ لِلۡحَیِّ الۡقَیُّوۡمِ ؕ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ حَمَلَ ظُلۡمًا (۱۱۱)

'عنو' کے معنی فروتنی اور عجز و تذلل کے اظہار کے ہیں اور 'ظلم' سے مراد، جیسا کہ ہم متعدد مقامات میں واضح کر چکے ہیں، شرک ہے۔

شفاعتِ باطل کے امیدواروں کے ایک زعم کی تردید

یہ شفاعتِ باطل کے امیدواروں کے ایک اور زعم باطل کی تردید ہے۔ وہ اپنے جن مزعومہ شرکاء کو اپنا سفارشی سمجھے بیٹھے تھے ان کے متعلق یہ گمان بھی رکھتے تھے کہ خدا کے ہاں ان کو بڑے ناز و تدلل کا مقام حاصل ہے' وہ جو بات چاہیں خدا کے سامنے جرأت و اعتماد اور ناز و اصرار کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں اور خدا کو ان کی ناز برداری اس قدر محبوب و مطلوب ہے کہ وہ بہر حال ان کی بات مانتا اور ان کی سفارش پوری کرتا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اس قسم کے واہمہ میں مبتلا ہیں وہ اس کو اپنے ذہن سے نکال ڈالیں۔ خدا کے سامنے کسی کو بھی ناز و تدلل کا مقام حاصل نہیں ہے۔ اس کے سامنے ناز و تدلل کے بجائے سب کے چہرے خشیت و تذلل کے ساتھ جھکے ہوئے ہوں گے۔

یہاں اسمائے حسنیٰ میں سے 'حی' اور 'قیوم' کا حوالہ ہے۔ ان اسماء کے حوالہ کا ایک خاص محل ہے۔ مشرکین عرب کے متعلق ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ جہاں تک خدا کے ماننے کا تعلق ہے وہ خدا کو مانتے تھے لیکن اپنے شرکیہ عقائد کے تحت اس کی حیثیت انھوں نے بالکل وہ بنا کے رکھ دی تھی جو معاذ اللہ گھر کے ایک بڑے بوڑھے ناکارہ وجود کی ہوتی ہے جو اپنی ساری ذمہ داریاں دوسروں کے سپرد کر کے خود گوشہ نشین بن کے بیٹھ جاتا ہے۔ اس

[illegible] خدا سے بالکل بے نیاز کر کے ان کا سارا اعتماد ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء پر جما دیا تھا۔ یہاں قرآن نے [illegible] کے اس زعم باطل پر بھی ضرب لگائی اور فرمایا کہ خدا کوئی ناکارہ وجود نہیں بلکہ زندہ خدا ہے اور اپنی پیدا کی ہوئی اس دنیا کے سارے معاملات کو دوسروں کے اوپر چھوڑ کر کسی گوشہ میں ایک خاموش علۃ العلل بن کر نہیں بیٹھا ہے بلکہ 'قیوم' یعنی اس کائنات کے سارے نظم کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو خود اپنی نگرانی اور اہتمام میں چلا رہا ہے۔

شرک باعثِ نامرادی ہے

'وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا'۔ 'ظلم' سے مراد شرک ہے اور یہاں اس لفظ کی تنکیر اس بات پر دلیل ہے کہ شرک کی جس نوع کا بھی کوئی مرتکب ہوگا وہ آخرت میں خاسر اور نامراد ہوگا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شرک صرف یہی نہیں ہے کہ کوئی شخص بت پرستی کرے بلکہ اس کی جلی اور خفی بہت سی قسمیں ہیں اور اس کی ہر قسم باعثِ خسران و نامرادی ہے۔ ہم اس کی مختلف قسموں کی وضاحت اپنی اس کتاب میں بھی موقع موقع سے کر رہے ہیں اور اس موضوع پر 'حقیقت شرک' کے عنوان سے ہم نے مستقل کتاب بھی لکھی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (١١٢)

'ظلم' اور 'هضم' کا مفہوم

'ظلم' اور 'هضم' دونوں لفظ جب ایک ساتھ استعمال ہوں تو 'ظلم' کے اندر حق تلفی کا مفہوم پایا جاتا ہے اور 'هضم' کے اندر غصب اور تعدی کا۔ یعنی ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی کا حق جو آپ پر عاید ہوتا ہے آپ اس کو دبا بیٹھیں۔ یہ ظلم ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ تعدی کر کے دوسرے کے پاس جو کچھ ہے اس کو چھیننے اور غصب کرنے کی کوشش کریں۔ یہ 'هضم' ہے۔

اوپر والی آیت میں فرمایا کہ جو کسی نوع کے شرک کا مرتکب ہوا وہ نامراد ہوا۔ یہ اس کے مقابل میں فرمایا کہ جو اعمال صالحہ کرے گا اور وہ مومن بھی ہو تو وہ اپنے اعمال کا بھرپور صلہ پائے گا نہ اس کو کسی حق تلفی کا اندیشہ ہوگا نہ کسی تعدی کا۔

'وَهُوَ مُؤْمِنٌ' کا مفہوم ظاہر ہے کہ یہاں یہ ہے کہ وہ توحید پر قائم رہتے ہوئے نیک اعمال کرے۔ اگر اس میں شرک کی کوئی آلودگی ہو تو پھر اس کے اعمال کی خدا کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں ہے۔ اگر کوئی عمل خدا کی رضامندی کے لیے نہ کیا جائے بلکہ کسی اور غرض کے لیے کیا جائے تو اس کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے اگرچہ وہ بظاہر نیکی ہی کا کام کیوں نہ ہو!

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا (١١٣)

اصل سلسلۂ کلام نئی تمہید کے ساتھ

اس کا عطف اوپر والی بات پر ہے جہاں سے یہ سلسلۂ کلام چلا ہے۔ آیات ٩٩-١٠٠ میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے خاص اپنے پاس سے تمہیں یہ یاددہانی (قرآن) عطا فرمائی ہے تو جو اس سے منہ موڑیں گے وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔ اس کے بعد انذار کے لیے قیامت کا ذکر آ گیا تھا۔ قیامت کے ذکر کے بعد وہی اصل مضمون ایک نئی تمہید اور مزید تفصیل کے ساتھ از سرِ نو آ گیا۔ فرمایا کہ اسی مقصد تذکیر کے لیے ہم نے

یہ قرآن عربی زبان میں اتارا ہے اور اس میں گوناگون پہلوؤں سے ان عواقب و نتائج کی وضاحت کر دی ہے جن سے اس کی تکذیب کرنے والوں کو لازماً دوچار ہونا پڑے گا تاکہ لوگ اگر تقویٰ اور خدا ترسی کی راہ اختیار کرنا چاہیں تو وہ اختیار کریں اور اگر یہ نہیں تو پھر ہماری طرف سے ان کو یاد دہانی ہو جائے تاکہ اگر وہ ہماری پکڑ میں آئیں تو وہ یہ عذر نہ کر سکیں کہ ان کو یاد دہانی نہیں کی گئی۔

اہل عرب پر قرآن کا اتمام حجت

'قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا' کے الفاظ یہاں اہل عرب پر بطور اظہار احسان و امتنان کے بھی ہیں اور بطور اتمام حجت و قطع عذر کے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کو عربی زبان میں اتار کر ان لوگوں پر اپنا سب سے بڑا فضل بھی فرمایا کہ اپنی تذکیر و تعلیم کے لیے انہی کی زبان کو منتخب کیا اور اس طرح ان پر حجت بھی تمام ہو گئی۔ اب یہ قیامت کے روز یہ عذر نہیں کر سکتے کہ اگر ان کے پاس کوئی رسول، ان کی اپنی زبان میں کوئی کتاب لے کر آتا تو یہ سب سے زیادہ ہدایت کے اختیار کرنے والے بنتے۔ اس قرآن نے ان تمام عذرات کا خاتمہ کر دیا!

'صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ'۔ تصریف کا مفہوم ہم متعدد جگہ واضح کر چکے ہیں کہ کسی بات کو گوناگون و بوقلموں اسالیب سے پیش کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو یہ کتاب ہم نے ان کی اپنی زبان عربی میں اتاری، پھر یہ کہ اس سے اعراض کے جو نتائج ہوں گے ان کو مبہم نہیں چھوڑا بلکہ ان کو عقل کے، نقل کے، تاریخ کے، آفاق کے، انفس کے دلائل سے اچھی طرح مبرہن کر دیا ہے۔ اب اگر اس اہتمام کے بعد بھی یہ اس سے فائدہ نہ اٹھائیں تو نتائج کی ذمہ داری خود ان پر ہے!

'لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا'۔ یعنی اصل مقصود تو اس تمام اہتمام سے یہ ہے کہ ان کے اندر تقویٰ اور خدا ترسی پیدا ہو اور اگر یہ نہیں تو ان کو ہماری طرف سے یاد دہانی ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں کس لیے برپا کیے گئے تھے اور اب کیا بنا رہے ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن نے عربوں کو ان کی وہ اصل تاریخ بھی از سر نو یاد دلائی ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے ان کے باپ حضرت اسمٰعیلؑ کو اس سرزمین میں ایک خاص مشن کے ساتھ بسایا تھا۔ اس کی وضاحت دوسرے مقامات میں تفصیل کے ساتھ ہو چکی ہے۔ آیت میں 'احداث' کا لفظ اسی پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ 'احداث ذکر' کا اصل مفہوم کسی سرگزشت کی از سر نو یاد دہانی ہے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ؗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (۱۱۴)

نزول قرآن کے لیے آنحضرتؐ کے اندر بے قراری کی اصل وجہ

اس آیت کا صحیح مفہوم ذہن نشین کرنے کے لیے سورۂ مریم کی آیات ۶۴-۶۵ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ مخالفین کی تمام مخالفتوں اور دراز نفسیوں کے مقابلہ کے لیے آنحضرت صلعم کے پاس واحد ہتھیار قرآن ہی تھا۔ اس وجہ سے قدرتی طور پر اس کے اترنے کے لیے آپؐ کے اندر ایک بے قراری اور بے چینی پائی جاتی تھی۔ اسی سے مشکلات میں آپؐ کو رہنمائی ملتی تھی، یہی چیز الجھنوں اور پریشانیوں میں تسلی کا ذریعہ بنتی تھی اور مخالفین جو نت نئے مطالبات و اعتراضات روز روز پیش کرتے ان کے فیصلہ کن جواب بھی قرآن

ہی دے سکتا تھا۔ ان وجوہ سے اس سپاہی کی طرح جو دشمنوں کی دَل بادل فوج کے مقابل میں نبرد آزما ہو، آپ کو ہر وقت، اس آسمانی کمک کا انتظار رہتا۔ حضورؐ کی اسی پریشانی کو دور کرنے کے لیے ارشاد ہوا کہ تم قرآن کے اتارے جانے کے لیے جلدی نہ کرو۔ خدا کی ذات بڑی ہی برتر اور بلند ہے۔ اپنی حکمتوں اور مصلحتوں کو وہ خود ہی جانتا ہے۔ وہی اس کائنات کا بادشاہ حقیقی ہے اور تم جو یاددہانی لوگوں کو سنا رہے ہو وہ اسی بادشاہ حقیقی کا فرمان ہے۔ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں ہے۔ تم لوگوں کے رد و قبول سے بالکل بے نیاز ہو کر جس تدریج اور ترتیب سے یہ اتر رہا ہے لوگوں کو سناتے رہو۔ اس کی تکمیل کے لیے خدا نے جو مدت مقرر کر رکھی ہے وہ اس کی حکمت و مصلحت سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس مدت سے پہلے اس کے اتار دیے جانے کے لیے جلدی نہ کرو۔ البتہ یہ دعا برابر کرتے رہو کہ اے رب میرے علم کو زیادہ کر!۔

یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اسی سیاق و سباق کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ہمارے مفسرین نے ان آیات کو اس محدود مفہوم میں لیا ہے کہ حضرت جبریلؑ جب آنحضرتؐ کو وحی سناتے تو آپؐ اس کو سیکھنے میں عجلت کر دیتے جس پر آپؐ کو ٹوکا گیا۔ اگرچہ یہ بات بجائے خود صحیح ہے کہ جس چیز کے لیے شوق و بے قراری ہو جذبۂ شوق اس کے لیے جلد باز بنا دیتا ہے، ہمارے ہاں اگر کوئی ایسا نامۂ محبت آئے جس کے لیے ہم نے بے چینی کی گھڑیاں گزاری ہوں تو ہم یہی چاہیں گے کہ اس کو ایک ہی سانس میں پورا پڑھ ڈالیں۔ یہ جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور قرآن کے معاملہ میں حضورؐ کے اندر یہ جذبہ ضرور رہا ہو گا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ یہاں آپؐ کو اس چیز پر ٹوکا گیا ہے۔ اس کا اصل پس منظر وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ آگے بھی اس مضمون کی آیات بار بار آئیں گی۔ ان سے انشاء اللہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

وَلَقَدۡ عَهِدۡنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبۡلُ فَنَسِيَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَهُۥ عَزۡمٗا (۱۱۵)

'عَهِدۡنَآ إِلَىٰٓ' کا مفہوم ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں۔ یہ اسلوب بیان کسی کو کوئی خاص ہدایت یا وصیت تاکید و اہتمام کے ساتھ کرنے کے لیے آتا ہے۔

عجلت سے احتراز کی ہدایت

اوپر کی آیت میں آنحضرتؐ کو قرآن کے معاملہ میں جلدی کرنے سے روکا ہے۔ اب اس جلدی کے نقصانات واضح کرنے کے لیے حضرت آدمؑ اور ابلیس کے ماجرے کا حوالہ دیا ہے کہ یہی عجلت آدمؑ کے لیے مزلۂ قدم ثابت ہوئی۔ انسانی فطرت کے اسی ضعف سے ابلیس نے فائدہ اٹھایا اور آدمؑ کو ورغلا کر اللہ کی اس ہدایت سے غافل کر دیا جو ان کو ایک خاص درخت کے پھل سے احتراز کے لیے کی گئی تھی۔ جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ آدمؑ کو جنت سے نکل کر اس دنیا کے دار الابتلاء میں آنا پڑا۔ مقصود اس ماجرے کی یاددہانی سے یہ ہے کہ یہ عجلت کسی کو بھی راس نہیں آئی ہے۔ اوپر حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت میں بھی یہ حقیقت واضح فرمائی گئی کہ ان کی عجلت بھی ان کو راس نہیں آئی بلکہ ان کے اور ان کی قوم کے لیے ایک سخت آزمائش بن گئی۔ ان واقعات کے پردے میں آنحضرتؐ کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آپ بھی اپنی دعوت کے معاملے میں جلدی نہ کریں بلکہ صبر و عزم کے ساتھ درجہ بدرجہ جس

طرح آپ کو ہدایت کی جا رہی ہے اپنے کام میں لگے رہیں۔ اگر آپ نے جلدی کی تو، خواہ وہ کتنے ہی اچھے مقصد کے لیے ہو، اس سے اندیشہ اس بات کا ہے کہ آپ کی امت کی تربیت میں خامی رہ جائے اور کوئی شیطان یا سامری اس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو ایک فتنہ میں مبتلا کر دے۔

'مِنْ قَبْلُ' ماضی کی سرگزشت کی یاددہانی ہے۔ یعنی جس طرح آج تمھیں عجلت نہ کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے اسی طرح پہلے تمھارے اور تمام نسل آدم کے باپ آدم علیہ السلام کو بھی ہدایت کی گئی تھی لیکن وہ اس کو ملحوظ نہ رکھ سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شیطان کے فریب میں آگئے۔ چونکہ ماضی کے تجربات، بالخصوص جب کہ وہ اپنے ہی ابوالآباء کی زندگی سے تعلق رکھنے والے ہوں، نسل حاضر و مستقبل کے لیے نہایت سبق آموز ہوتے ہیں اس وجہ سے اشارہ فرما دیا کہ پہلے کے واقعات و تجربات کو پیش نظر رکھو۔

'فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا'۔ 'نسی' یہاں نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے مفہوم میں ہے۔ یعنی حضرت آدمؑ کو جو ہدایت کی گئی ایک وقتی جذبۂ عجلت سے مغلوب ہو جانے کے سبب سے وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور وہ مضبوط عزم کے ساتھ اس پر قائم نہ رہ سکے۔ حضرت آدمؑ کو جو ہدایت کی گئی تھی اور ان سے جو لغزش صادر ہوئی اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ اس آیت میں صرف یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ جذبات و داعیات جتنے بھی ہیں سب انسانی سرشت کے اجزا ہیں لیکن ان کے لیے حدود و قیود ہیں۔ اگر وہ اپنے حدود کے اندر رہیں تب تو وہ فرد اور معاشرہ سب کے لیے خیر و برکت ہیں لیکن اگر ان میں سے کسی کی باگ ذرا ڈھیلی چھوڑ دی جائے تو پھر وہ فرد اور سماج دونوں کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ ان داعیات و جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے آدمی کو اپنے اندر صبر اور عزم کی صفت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ اسی صفت کو پیدا کر کے آدمی اپنے رہوارِ نفس کو قابو میں رکھ سکتا ہے، ورنہ معلوم نہیں کون سا جذبہ اس کو کس فتنہ میں مبتلا کر دے۔ عجلت بھی انسان کے جذبات میں سے ایک جذبہ ہے اور یہ اس کی سرشت میں داخل ہے۔ خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (انبیاء۔ ۳۷) اور وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا (اسراء۔ ۱۱) وغیرہ آیات میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن یہ انسان کے لیے نافع اسی وقت تک ہے جب تک یہ آدمی کے صبر اور عزم کے کنٹرول میں رہے۔ اگر یہ صبر اور عزم پر غالب ہو جائے تو پھر یہ انسان کے لیے بہت بڑا خطرہ بھی بن سکتا ہے۔

'وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا'۔ عزم کا صحیح مفہوم صبر اور عزیمت و استقامت ہے، جس کا ضد بے صبری اور جلد بازی ہے۔ یہاں اصل مقصدِ کلام حضرت آدمؑ کی بے صبری اور جلد بازی ہی کی طرف اشارہ کرنا اور اس کے عواقب سے آنحضرتؐ کو آگاہ کرنا ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ۖ أَبَىٰ (۱۱۶)

اجمال کے بعد تفصیل

اوپر والی آیت میں قصۂ آدمؑ و ابلیس کا وہ خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے جو یہاں اس کے بیان سے مدنظر ہے۔ اس کے بعد اب اصل قصہ کی تفصیل آ رہی ہے۔ قصوں کی تفصیل سے پہلے ان کا خلاصہ نگاہ کے سامنے کر دینے

سے نظمِ کلام کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ اسلوبِ بیان قرآن نے جگہ جگہ اختیار کیا ہے۔ اصحابِ کہف کے واقعہ کے بیان کرنے میں بھی قرآن نے یہی اسلوب اختیار فرمایا ہے اور ہم اس کی وضاحت اس کے محل میں کر چکے ہیں۔

قصۂ آدم و ابلیس کا د سبق

فرمایا کہ، یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو تعظیم بجا لاؤ تو سب نے اس حکم کی تعمیل کی مگر ابلیس نے اس کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ یہ ماجرا سورۂ بقرہ اور اعراف میں بھی بیان ہو چکا ہے اور ہم وہاں اس کے ہر جزو پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے دہرانے میں طوالت ہوگی۔ بقرہ کی آیات ۳۰-۳۹ کے تحت تدبرِ قرآن جلد اول کے صفحات ۱۱۲-۱۳۰ پر اور اعراف کی آیات ۱۱-۲۴ کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس حکم کی حکمت، سجدہ کی نوعیت، فرشتوں کے ساتھ اس حکم میں جنات کی شرکت کی علت، ابلیس اور اس کے غرور و استکبار، ہر چیز پر اپنے علم کے حد تک ہم نے گفتگو کی ہے۔

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (۱۱۷)

ابلیس نے صرف سجدہ کرنے ہی سے انکار نہیں کیا بلکہ، جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیات ۱۴-۲۲ کے تحت ہم وضاحت سے بیان کر آئے ہیں اس نے جوشِ حسد میں خود اللہ تعالیٰ کو یہ چیلنج کیا کہ اگر تو مجھے آدمؑ اور اس کی ذریت کو ورغلانے کی مہلت دے دے تو میں یہ ثابت کر دوں گا کہ نہ یہ مجھ پر کسی فضیلت کے سزاوار ہیں اور نہ اس جنت کے حقدار ہیں بلکہ میں ان میں سے اکثر کو اپنا مرید و ہمنوا بنا لوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو اس کو مہلت دے دی کہ جا تو جس کو ورغلا سکتا ہے ورغلا لے، میں تجھ کو اور تیرے سارے مریدوں کو جہنم میں جھونک دوں گا اور دوسری طرف حضرت آدمؑ کو آگاہ فرما دیا کہ تم جنت میں رہو لیکن اس امر کو یاد رکھو کہ ابلیس تمہارا ابدی دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں کسی گمراہی میں مبتلا کر کے جنت سے نکلوا چھوڑے اور تم محروم و نامراد ہو کر رہ جاؤ۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۙ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۱۱۸-۱۱۹)

جنتِ آدم کی جامع تعریف

ان دو آیتوں میں اس جنت کی نہایت ہی جامع تعریف ہے جس میں حضرت آدمؑ رکھے گئے تھے۔ فرمایا کہ اس میں نہ تم بھوکے ہو گے نہ ننگے، نہ اس میں تمہیں پیاس ستائے گی، نہ دھوپ۔ دوسرے لفظوں میں اگر اس بات کو کہنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں تم سردی اور گرمی دونوں کے آزار سے محفوظ رہو گے۔ سردی کے آزار میں سے بھوک اور عریانی ہے اور گرمی کی تکالیف میں سے پیاس اور دھوپ۔ جن لوگوں کی نظر اہلِ عرب کے کلام پر ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ بسا اوقات سردی اور گرمی کی تکالیف کا ذکر اسی طرح کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ پیاس کا ذکر بھوک کے ساتھ اور دھوپ کا ذکر عریانی کے ساتھ زیادہ موزوں ہوتا۔ ہمارے نزدیک یہ رائے عربیت کے ذوق سے محرومی کا نتیجہ ہے۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (۱۲۰)

آدمؑ پر ابلیس کا کامیاب حملہ

ابلیس اگرچہ استکبار اور حکمِ خداوندی کی نافرمانی کے باعث جنت سے راندہ ہو چکا تھا لیکن اس نے قیامت تک کے لیے آدمؑ اور اولادِ آدمؑ پر اپنا چلتر آزمانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مہلت حاصل کر لی تھی اس وجہ سے

وہ حضرت آدمؑ کے پاس جنت میں بھی وسوسہ اندازی کے لیے پہنچ گیا اور ان کو سمجھایا کہ ایک خاص درخت کے پھل سے جو تمھیں روک دیا گیا ہے اس کا راز یہ ہے کہ ابدی زندگی اور ابدی بادشاہی کا درخت وہی ہے۔ اگر تم ابدی زندگی اور لازوال بادشاہی چاہتے ہو تو اس درخت کا پھل چکھو ورنہ آخر اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم اس جنت میں ہمیشہ رہو گے! اوّل تو انسان کے اندر یہ کمزوری موجود ہے کہ وہ جس چیز سے روک دیا جائے اس کا حریص بن جایا کرتا ہے۔ ثانیاً حضرت آدمؑ کو یہ کھٹکا بھی تھا کہ اس جنت سے وہ نکالے بھی جا سکتے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ڈرایا تھا کہ ابلیس تمھارا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو جنت سے نکلوا چھوڑے۔ ابلیس نے آدمؑ کے اسی اندیشہ کو تاڑ لیا اور نہایت خیرخواہانہ انداز میں ان کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ اگر وہ ابدی زندگی اور ابدی بادشاہی چاہتے ہیں تو انھیں اس درخت کا پھل کھا لینا چاہیے۔ اس خواہش کے غلبہ نے ان کو اس یاددہانی سے بالکل غافل کر دیا جو اللہ تعالیٰ نے ان کو شیطان کی دشمنی سے متعلق فرمائی تھی۔ وہ اپنے دشمن کو اپنا خیرخواہ سمجھ بیٹھے اور اس کے چکمہ میں آ گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شیطان اگرچہ بنی آدم کا ابدی دشمن ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ کامیاب حملہ وہ ہوتا ہے جو وہ دوست اور خیرخواہ کے بھیس میں کرتا ہے۔ وہ اسی بھیس میں آ کر وسوسہ اندازی کرتا ہے اور انسان کو یہ باور کراتا ہے کہ خدا اور رسول نے اس کو جن چیزوں سے روکا ہے اس کی تمام تہذیب و ترقی کا راز اگر ہے تو بس انھی چیزوں کے اختیار کرنے میں ہے۔ آج کے حالات کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہو گا کہ تمام محرمات شریعت کی اباحت کی سب سے بڑی دلیل جو شیطان کے ایجنٹ پیش کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ اگر ان چیزوں کے باب میں مذہب کے فتوے پر عمل کیا جائے تو تمام تہذیب و ترقی کا جنازہ نکل جائے گا!

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیت میں جو مضمون بیان ہوا ہے یہی مضمون سورۂ اعراف میں یوں آیا ہے مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ (۲۰) (تمھارے رب نے تم دونوں کو صرف اس وجہ سے اس درخت سے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے اور زندگیٔ دوام کے مالک نہ بن جاؤ) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت زیر بحث میں 'مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى' (ایسی بادشاہی جس پر کبھی زوال نہ آئے) کے الفاظ ہیں اور اعراف میں 'اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ' (کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ بن جاؤ) کے الفاظ ہیں۔ ان دونوں باتوں کے اندر تضاد نہ سہی لیکن فرق تو بہرحال ہے تو آخر ان میں تطبیق کی کیا شکل ہے؟ اسی مشکل سے بچنے کے لیے بعض لوگوں نے 'مَلَكَيْنِ' کو 'مَلِكَيْنِ' بکسر لام پڑھا ہے یعنی کہیں تم دونوں بادشاہ نہ بن جاؤ اور اس طرح انھوں نے ان دونوں آیتوں میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اوّل تو اس صورت میں بھی پوری تطبیق نہیں ہوتی ثانیاً ہمارے نزدیک متواتر اور مشہور قراءت صرف مصحف ہی کی قراءت ہے اور ہم غیر متواتر قراءت پر قرآن کی کسی آیت کی تاویل کو صحیح نہیں سمجھتے۔

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ابلیس نے حضرت آدمؑ و حوا کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے

ان کو مختلف قسم کی ترغیبات دیں۔ کبھی ان کو فرشتے بن جانے کی امید دلائی، اور کبھی ابدی و لازوال بادشاہی حاصل ہو جانے کی توقع دلائی۔ اس بات کی طرف ہمارا ذہن اس وجہ سے جاتا ہے کہ اعراف میں اس بات کی تصریح ہے کہ حضرت آدمؑ کو اپنے دام میں لانے کے لیے ابلیس کو بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ اس نے بڑی قسموں اور بڑی اطمینان دہانیوں کے بعد ان کو رام کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اعراف کی آیت ۲۲ میں فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ کے الفاظ ہیں۔ ہم نے وہاں ان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا صحیح مفہوم کسی کو درجہ بدرجہ اپنے ڈھب پر لانے یا شیشہ میں اتارنے کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ ابلیس کے ایک ہی فقرے میں اس کے چکمے میں نہیں آ گئے بلکہ اس نے مختلف مواقع پیدا کر کے ان کو مختلف قسم کے فریب دیے یہاں تک کہ وہ اس کے دام میں پھنس گئے۔ کبھی یہ کہا کہ خدا نے تم کو اس درخت سے اس اندیشہ سے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، اور کبھی یہ کہا کہ اس وجہ سے اس سے منع کیا ہے کہ تمہیں لازوال بادشاہی نہ حاصل ہو جائے۔ مقصد تو کسی نہ کسی طرح اپنے دام فریب میں لانا تھا اس وجہ سے جس وقت جو بات بن سکی وہ اس نے بنانے کی کوشش کی۔

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۚ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (۱۲۱)

اس آیت کی وضاحت بقرہ کی تفسیر میں بھی ہو چکی ہے اور اعراف کی آیت ۲۲ کے تحت بھی۔ یہاں ان ساری باتوں کے دہرانے کی گنجائش نہیں ہے۔ 'غَوٰى' کے معنی 'ضَلَّ وَخَابَ' کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمؑ ابلیس کے چکمے میں آ کر شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھا بیٹھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو جو حلۂ جنت پہنایا گیا تھا اور جس کی نسبت، جیسا کہ آیت ۱۱۸ میں گزرا، اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ تھا کہ اس سے وہ کبھی محروم نہیں ہوں گے، وہ ان سے چھن گیا اور وہ گھبراہٹ میں باغ کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانکنے لگے۔ 'وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى' یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو جو ہدایت دی تھی وہ اس پر قائم نہ رہ سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ صحیح راہ سے بھٹک گئے۔ 'وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ' سے حضرت آدمؑ و حوا کی اس گھبراہٹ اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا ہے جو دفعۃً حلۂ جنت سے محروم ہو جانے کے باعث ان پر طاری ہوئی۔ انھوں نے ابدی جنت کے حصول کی طمع میں یہ اقدام کیا لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ جو حاصل تھی وہ بھی ہاتھ سے گئی۔

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى (۱۲۲)

'اجتباء' کا مفہوم — آدمؑ کی توبہ کا اثر

یہاں 'اجتباء' کا ذکر ان کی توبہ اور قبولیت توبہ سے پہلے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس 'اجتباء' سے مراد حضرت آدمؑ کو توفیقِ توبہ اور کلماتِ توبہ سے سرفراز فرمانا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہی مضمون یوں آیا ہے۔ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۳۷ (پس آدمؑ نے اپنے رب کی طرف سے کچھ کلمات سیکھ لیے اور توبہ کی تو اس کے رب نے اس کی توبہ قبول فرمائی، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور بڑا ہی رحیم ہے) سورۂ اعراف میں ان کلماتِ توبہ کی وضاحت بھی ہے۔ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ

تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ ۲۳ (انھوں نے دعا کی کہ اے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم نامراد ہو کے رہ جائیں گے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے جو لغزش ہوئی وہ اس پر سخت، نادم ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو بندہ اپنے گناہ پر شرمسار ہوتا ہے وہ اس کو توبہ و اصلاح کی توفیق بخشتا ہے اور توبہ و اصلاح کے بعد اس کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے سے قریب کر لیتا ہے۔ اسی چیز کو یہاں 'اجتبٰہ' سے تعبیر فرمایا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ بڑا ہی خوش بخت ہے وہ انسان جس کو احساسِ ندامت اور توفیق توبہ کے ساتھ ساتھ ربِّ کریم کی طرف سے توبہ کے کلمات تلقین ہوں۔

'تَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى' 'تاب' کے بعد جب 'علیٰ' آتا ہے تو، جیسا کہ ہم بقرہ، ۳۷ کے تحت وضاحت کر چکے ہیں، یہ رحم کے مضمون پر بھی متضمن ہوتا ہے۔ یعنی اللہ نے اس کی توبہ قبول کی اور اس پر رحم فرمایا اور اس کو ہدایت دی۔ "ہدایت دی" سے مراد ظاہر ہے کہ آگے کے مراحل کے لیے ہدایت دینا ہے تاکہ آدمؑ اور ان کی ذریت شیطان کے فتنوں کا مقابلہ کر سکے۔

عیسائیوں اور نبوتِ آدم کے منکروں کی تردید

اس آیت سے عیسائیوں کے اس خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو ان کے ہاں آدمؑ اور ان کی ذریت کے ابدی گنہگار رہنے کا پایا جاتا ہے اور ان لوگوں کے خیال کی بھی تردید ہوتی ہے جو حضرت آدمؑ کو صرف نسلِ انسانی کا باپ مانتے ہیں، ان کو نبی نہیں مانتے۔ اس آیت کے الفاظ بھی ان کی نبوت پر دلیل ہیں اور عقل بھی یہ تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اور ان کی ذریت کی رہنمائی کے لیے ان کے حسبِ حال ان کو شریعت عطا فرمائے۔ آگے کی آیت میں اس کی وضاحت آرہی ہے۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (۱۲۳)

بقرہ آیت ۳۶ اور اعراف آیت ۲۴ کے تحت، اس آیت کے تمام متعلقات، پر گفتگو ہو چکی ہے۔ ہم نے ان آیات، کے تحت، وہ حکمت بھی واضح کی ہے جو مقتضی ہوئی کہ حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت اس دنیا میں آکر شیطان کا مقابلہ کریں اور یہ بات بھی واضح کی ہے کہ ان آیات میں خطاب حضرت آدمؑ و حوا سے نہیں بلکہ آدمؑ اور ابلیس سے بحیثیت دو فریقوں کے ہے۔

'بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ' یعنی شیطان تمہارا دشمن ہو گا اور تم، اگر تمہیں اپنی عاقبت عزیز ہے اور پھر جنت حاصل کرنے کے آرزو مند ہو، شیطان کے دشمن ہو گے اس لیے کہ ہر عاقل اپنے دشمن کو دشمن سمجھتا اور اس سے چوکنا رہتا ہے۔ صرف احمق اور ناعاقبت اندیش ہی ہوتا ہے جو اپنے دشمن سے دوستی گانٹھتا اور اس کے مشوروں پر کار بند ہوتا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

جن لوگوں نے محض اس غلط فہمی کی بنا پر کہ یہاں مثنیٰ کا صیغہ استعمال ہوا ہے اس کا مخاطب حضرت آدمؑ اور

ہوا کرتا ہے ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ اوّل تو بعینہٖ یہی بات بقرہ اور اعراف وغیرہ میں جمع کے صیغہ سے ارشاد ہوئی ہے، ثانیاً یہاں اگر مثنیٰ کا صیغہ آیا ہے تو اس کے ساتھ لفظ جَمِیْعًا بھی ہے، اگر مخاطب حضرت آدمؑ اور حواؑ ہی ہیں تو یہ لفظ بالکل بے ضرورت ہو کے رہ جاتا ہے۔ ثالثاً آدمؑ و حواؑ میں فطری تعلق عداوت کا نہیں بلکہ محبت کا ہے۔ میاں بیوی میں اگر عداوت ہوتی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ خدانخواستہ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ واقع ہوئے ہیں بلکہ شیطان کی دراندازی اور فساد انگیزی سے پیدا ہوتی ہے۔ البتہ شیطان اور ان کے مابین دشمنی فطری ہے اور یہ دشمنی قیامت تک کے لیے ہے۔ شیطان کی دشمنی تو واضح ہے کہ وہ جذبۂ حسد ہے اور اس کا وہ کھلم کھلا اعلان کر چکا ہے۔ رہا انسان تو وہ اگر ذی ہوش ہے تو اس کو یہ حقیقت ہمیشہ مستحضر رکھنی چاہیے کہ وہ اسی دشمن سے نبرد آزمائی کے لیے جنت سے نکال کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اگر وہ اس سے دوستی کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود اپنے دشمن کے آگے سپرانداز ہوتا ہے۔

شیطان کے مقابلہ کے لیے ہتھیار

'فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی'۔ یہ وہ ہتھیار ہے جو اللہ تعالیٰ نے شیطان کے مقابلہ کے لیے آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو مہیا فرمانے کا وعدہ فرمایا۔ چونکہ انسان اس دنیا میں بڑے ہی شاطر دشمن سے نبرد آزمائی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ اس کو عقل و فطرت کی ہدایت کے ساتھ ساتھ خاص اپنے پاس سے وحی کی ہدایت سے سرفراز فرمائے تاکہ وہ دہری طاقت و ہمت کے ساتھ شیطان کا مقابلہ کر سکے۔ فرمایا کہ اب تم یہاں سے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے تو جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے نہ وہ شیطان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوں گے اور نہ اس جنت سے محروم رہیں گے جس سے محروم رکھنے کے لیے شیطان نے قسم کھائی ہے۔

اس آیت سے دو باتیں بالکل واضح طور پر ثابت ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس دنیا میں شیطان کے فتنوں سے امان میں رہنے کا واحد ذریعہ اللہ کی کتاب ہے جو اس روشنی سے محروم ہے وہ ہر وقت شیاطین جن و انس کی زد میں ہے۔

حضرت آدمؑ نبی تھے

دوسری یہ کہ حضرت آدمؑ ایک نبی تھے۔ جب وہ شیطان کے ساتھ نبرد آزمائی کے لیے اس دنیا میں اتارے گئے ہیں اور اس سے مقابلہ کے لیے اللہ کی ہدایت ضروری ہے تو لازماً ان کی اور ان کی ذریت کی رہنمائی کے لیے، ان کے حالات کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے ان کو کوئی شریعت بھی دی ہو گی۔ ہم حضرت آدمؑ کی شریعت کے بعض احکام کی طرف سورۂ مائدہ کی تفسیر میں، بضمن قصۂ ہابیل و قابیل، اشارہ کر چکے ہیں۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (۱۲۴)

ایمان کے بغیر طمانیت نہیں حاصل ہوتی

'مَعِیْشَةً ضَنْكًا' کے معنی تنگ زندگی کے ہیں جو سکون و طمانیت اور فراغ خاطر و شرح صدر کی نعمت سے محروم ہو۔ فرمایا کہ جو ہماری اس یاددہانی سے اعراض کرے گا وہ دنیا میں سکون قلب و شرح صدر سے محروم زندگی گزارے گا اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔

طمانیتِ قلب ذکرِ الٰہی سے ہے

سکونِ قلب و شرحِ صدر سے اس کی زندگی کے محروم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک خلا ہے جو اللہ کے ایمان کے سوا اور کسی چیز سے نہیں بھر سکتا اس وجہ سے جب تک اس کو ایمان حاصل نہ ہو کوئی دوسری چیز اس کو تسلّی و طمانیت سے بہرہ مند نہیں کر سکتی۔ دوسری چیزیں خواہ وہ بظاہر کتنی ہی شاندار اور دلفریب کیوں نہ ہوں، وقتی بہلاوے کا کام تو دے سکتی ہیں لیکن قلب و روح کی بے قراری کو رفع نہیں کر سکتیں۔ جب بچہ بھوک سے روتا ہے تو اس کے منہ میں چُسنی یا نپل دے کر کچھ دیر کے لیے بہلایا جا سکتا ہے لیکن وہ آسودہ اسی وقت ہوتا ہے جب ماں اس کو چھاتی سے لگاتی اور اس کو دودھ پلاتی ہے۔ اس کے بغیر اس کی بے چینی نہیں جاتی۔ یہی حال انسان کا ہے وہ اپنے لیے جو اسباب و سامان بھی مہیا کر لے لیکن اگر وہ خدا کے ایمان سے محروم ہے تو وہ غیر مطمئن، ڈانواڈول، اندیشہ ناک، مضطرب اور اندرونی خلفشار میں مبتلا رہے گا، اگرچہ وہ اپنی نمائشوں سے اس پر کتنا ہی پردہ ڈالنے کی کوشش کرے۔ نفسِ مطمئنہ کی بادشاہی صرف سچے اور پکے ایمان ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ!

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ بہت سے لوگ ایمان کے مدعی ہوتے ہیں لیکن ان کی زندگی نہایت پریشان حالی و پراگندہ بالی کی ہوتی ہے۔ برعکس اس کے کتنے ہیں جو خدا کو محض ایک وہم سمجھتے ہیں لیکن وہ بڑی بے فکری و طمانیت کی زندگی بسر کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہاں بحث ایمان کے مدعیوں سے نہیں بلکہ حقیقی اہلِ ایمان سے ہے۔ ثانیاً جن لوگوں کو خدا سے بے پروا ہونے کے باوجود ہم مطمئن خیال کرتے ہیں ہم صرف ان کے ظاہری کروفر کو دیکھتے ہیں۔ اگر کبھی ان کے سینوں میں جھانک کر دیکھنے کا موقع ملے تب معلوم ہو کہ ان کے اندر کتنے خطرے اور کتنے خلجان چھپے ہوئے بیٹھے ہیں لیکن یہ ہر ایک کو نظر نہیں آتے۔ ان کو وہ خود دیکھتے ہیں یا وہ لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کے اندر ایمانی بصیرت ہو۔

ذکرِ الٰہی سے غافل قیامت کو اندھے اٹھیں گے

وَنَحۡشُرُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَعۡمٰی: اللہ کے ذکر سے اعراض کرنے والے قیامت کے روز اندھے اٹھائے جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ، کان اور دل کے پردے اٹھانے والی چیز اللہ کی یاددہانی ہے۔ اگر کوئی شخص اس یاددہانی سے اعراض کرتا ہے تو جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، وہ آنکھیں، کان اور دل و دماغ رکھتے ہوئے، اندھا بہرا اور لایعقل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ان عظیم نعمتوں کی ناقدری کی پاداش میں ایسے بلید جانوروں کو اندھا بنا کر اٹھائے گا۔ یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے صرف محسوسات کی غلامی کے لیے نہیں عطا فرمائی ہیں بلکہ ان حقائق کے مشاہدے کے لیے عطا فرمائی ہیں جو اس کائنات کے ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ پر نقش ہیں، اگر کوئی شخص سب کچھ دیکھتا ہے لیکن اس کو وہی حقیقت نظر نہیں آتی جو سب سے زیادہ نمایاں ہے تو ہر چند وہ سب کچھ دیکھتا ہے لیکن اس کو سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں!

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ قٓ میں فرمایا ہے فَکَشَفۡنَا عَنۡکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ

اَلْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۲۲ (پس ہم نے تیرے حجابات ہٹا دیے تو تیری نگاہ آج بہت تیز ہے) اور یہاں ارشاد ہوا ہے کہ ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے، تو ان دونوں میں تطبیق کس طرح ہو گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ سورۂ قٓ میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اس قیامت کی طرف سے بالکل غافل رہے لیکن آج سارے حقائق سامنے آ گئے اور سارے پردے چاک ہو گئے! اس اسلوب کلام کے اندر خاص بلیغ پہلو یہ ہے کہ اس دنیا میں تو محسوسات کے غلام اندھے بن کر زندگی گزارتے ہیں لیکن ان کو نہ صرف یہ کہ اپنے اندھے ہونے کا کوئی احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے آپ کو بڑا سقراط و بقراط اور بڑا ہی دانا و بینا سمجھتے ہیں لیکن قیامت کے دن ان کو اپنا اندھا ہونا نظر آ جائے گا۔ آج تو یہ حال ہے کہ ہمارے سائنس والوں کی آنکھیں تمام دوربینوں اور خورد بینوں سے مسلح ہونے کے باوجود اپنی آنکھیں دیکھنے سے بھی قاصر ہیں لیکن ایک دن آنے والا ہے جب سارے پردے اٹھ جائیں گے اور کسی کے لیے بھی مجالِ انکار باقی نہیں رہے گی، اسی انکشافِ حقیقت کو فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ سے تعبیر فرمایا ہے۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ؁ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى (۱۲۵-۱۲۶)

'نسی' کے معنی یہاں نظر انداز کرنے کے ہیں۔ لفظ کے اس مفہوم کی وضاحت دوسرے مقام میں ہو چکی ہے۔

فرمایا کہ جو لوگ اندھے اٹھائے جائیں گے وہ فریاد کریں گے کہ اے رب! ہم تو آنکھیں رکھنے والے لوگ تھے تو تو نے ہم کو اندھے بنا کر کیوں اٹھایا! ارشاد ہو گا کہ ہم نے تمہارے پاس اپنی کتاب بھیجی جس کی آیات نے ایک ایک حقیقت تم پر واضح کی لیکن تم ان کو نظر انداز کر کے بالکل اندھے بہرے بنے رہے۔ مطلب یہ کہ اگر آنکھیں تھیں تو وہ آنکھیں ہماری اس ساری تذکیر و تنبیہ کے باوجود کیوں نہ کھلیں؟ جب تم نے اس وقت اپنی آنکھیں نہیں کھولیں تو سزاوار ہو کہ تمہاری آنکھیں بند ہی رہیں۔

وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى: یعنی اب تمہارا یہ نالہ و شیون بے سود ہے۔ جس طرح تم نے ہماری آیات کو نظر انداز کیا اسی طرح تم سزاوار ہو کہ نظر انداز کیے جاؤ اور تمہاری اس فریاد پر کوئی توجہ نہ کی جائے!

وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى (۱۲۷)

'اسراف' کے معنی حدود سے تجاوز کے ہیں۔ یہاں 'مَنْ اَسْرَفَ' سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اپنی قوتیں اور صلاحیتیں ان چیزوں پر برباد کیں جن سے ان کو بچنا تھا اور جو چیزیں اختیار کرنے کی تھیں ان سے انھوں نے آنکھیں بند رکھیں۔ فرمایا کہ یہ احوالِ آخرت جو بیان ہوئے ہیں ہم اسی طرح ان لوگوں کو بدلہ دیں گے جو اپنی صلاحیتوں کو بالکل غلط ہدف پر برباد کریں گے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر مزید تنبیہ فرمائی کہ آخرت کا عذاب کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ دنیا کی تنبیہات پر قیاس کر کے اس کو کوئی ہون چیز نہ سمجھے۔ وہ نہایت سخت بھی ہو گا اور نہایت پائیدار بھی۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى (۱۲۸)

'اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ'، کا صحیح مفہوم ہماری زبان میں یہ ہوگا کہ کیا فلاں چیز ان کے لیے ہدایت دینے والی اور ان کی آنکھیں کھولنے والی نہ بنی؟

نشانی عذاب کے مطالبہ کا جواب

یہ کتاب الٰہی سے اعراض کرنے والوں کے مطالبۂ نشانی عذاب کا جواب ہے۔ فرمایا کہ ان کو عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو یہ نشانی عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں تو کیا یہ چیز ان کو ہدایت دینے والی نہ بنی کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو، اپنی تذکیر و تنبیہ سے اعراض کرنے کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور وہ قومیں کسی دوسرے خطۂ ارضی کی نہیں بلکہ اسی ملک کی رہنے بسنے والی تھیں۔ ان کے تباہ شدہ آثار اور ان کے کھنڈروں پر سے یہ لوگ اپنے تجارتی سفروں میں برابر گزرتے ہیں! یہ اشارہ عاد و ثمود وغیرہ کی بستیوں کی طرف ہے جن کا ذکر اہل عرب کے اشعار میں بھی ملتا ہے اور ان کا عام شاہراہوں پر ہونا بھی معلوم ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ کوئی نشانی چاہتے ہیں تو ان کے اپنے ملک کی تاریخ اور اس کے آثار میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ آخر یہ ان سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے؟ عاقل تو وہ ہے جو دوسروں کے انجام سے سبق حاصل کرے، نہ کہ جب وہی انجام اپنے سامنے آجائے تب مانے۔ اگر انسان یہ روش اختیار کرلے تو پھر اس میں اور حیوان میں فرق کیا رہا!

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى (۱۲۹)

'اَجَلٌ مُّسَمًّى' کا عطف 'كَلِمَةٌ' پر ہے۔

یہ اس مطالبۂ نشانی عذاب کا جواب ہے۔ فرمایا کہ اگر تمھارے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ پا چکی ہوتی اور اس کے ظہور کے لیے ایک مدت معین نہ ہو چکی ہوتی تو جس عذاب کے لیے یہ جلدی مچاتے ہوئے ہیں وہ آج ہی ان پر آ دھمکتا۔ یعنی اگر اس کے ظہور میں تاخیر ہو رہی ہے تو یہ خدا کی سنت اور اس کے طے کردہ قاعدے اور ضابطے کے تحت ہو رہی ہے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ مبتلا رہے کہ یہ محض ہوائی بات ہے یا یہ کہ اللہ ابھی اس کا سامان نہیں کر پا رہا ہے اس وجہ سے عذاب نہیں آ رہا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ آیا ہے۔ 'وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ' (الشوریٰ-۱۴) (اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے ایک مدت متعین تک کے لیے طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان آج ہی فیصلہ کر دیا جاتا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منکرین و مکذبین کے فیصلہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک یوم الحساب مقرر کر رکھا ہے جس کی مدت اور جس کا دن بھی معین ہے اس وجہ سے وہ جلد بازوں کی جلدی کے باوجود ان کو ڈھیل دے رہا ہے۔ بدقسمت ہیں وہ جو اس ڈھیل سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس کو اپنے طغیان میں اضافہ کا ذریعہ بنا لیں!!

یہاں 'كَلِمَةٌ' سے مراد کلمۃ الفصل ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یہ طے کر رکھا ہے کہ فیصلہ اور الفتح'، کا ایک دن آئے گا اور 'اَجَلٌ مُّسَمًّى' سے اس دن کے معین ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی اس کو مبہم و مجہول

نہ خیال کرے بلکہ منٹ اور سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ خدا کی جنتری میں وہ مندرج ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى (۱۳۰)

نبی صلعم کو صبر کی تلقین اور نماز کی تاکید

اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کی تمام بکواس پر صبر کی تلقین اور اس صبر کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ نماز کے اہتمام کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ صبر اور نماز کے باہمی تعلق پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ صبر کی بنیاد درحقیقت اس عقیدے پر ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی مشیت سے ہوتا ہے اور اس کی مشیت تمام تر خیر پر مبنی ہوتی ہے۔ اس عقیدہ کو دل میں راسخ اور ذہن میں مستحضر رکھنے کے لیے سب سے بڑا اور مؤثر ذریعہ نماز ہے۔

'وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ' تسبیح کا عام مفہوم تو ذکر الٰہی ہے اور یہ ذکر الٰہی ہر وقت مطلوب ہے لیکن یہاں اس کا ذکر اوقات کی قید کے ساتھ ہے۔ اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد نماز ہے۔ 'تسبیح' کے ساتھ 'حمد' کی قید ذکر الٰہی کی صحیح صورت بتانے کے لیے ہے کہ یہ خدا کی 'تسبیح' اور 'تحمید' دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہو۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے اور 'تحمید' میں اثبات کا۔ خدا کے ذکر کی صحیح شکل یہی ہے کہ اس کو تمام خلاف شان صفات سے بری اور تمام اعلیٰ صفات سے متصف قرار دیا جائے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک پہلو بھی صحیح طور پر ملحوظ نہ رہے تو خدا کے معاملے میں انسان کا تصور غلط ہو جاتا ہے جس سے اس کا سارا نظام فکر متزلزل ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعض مذاہب نے تنزیہہ کو اہمیت دی تو اس کی لے اس قدر بڑھا دی کہ خدا کو بالکل نرنکار اور خلق سے بالکل بے تعلق بنا کر رکھ دیا جس کے نتیجہ میں ان کو وسائل و وسایط کا سہارا ڈھونڈنا پڑا۔ قرآن نے اس فتنہ سے محفوظ رکھنے کے لیے تسبیح اور حمد دونوں کی ہدایت فرمائی تاکہ بندے کا تعلق اس کے رب کے ساتھ صحیح بنیاد پر استوار ہو سکے۔ بغیر اس تعلق کی استواری کے انسان کا قدم جادۂ مستقیم پر نہیں جم سکتا۔

اوقات نماز کی تعلیم

'قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا' سورج کے طلوع اور غروب ہونے سے پہلے فجر اور عصر کی نمازیں ہیں بخاری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی روایت ہے۔ ان دونوں نمازوں کے پہلے ذکر کرنے کی وجہ دین میں ان کی اہمیت ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے بھی ان دونوں نمازوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

'وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ' اور اوقات شب میں بھی نماز پڑھو۔ اوقات شب میں دو نمازیں ہیں ایک عشاء اور دوسری تہجد۔ یہاں فعل کا اعادہ تاکید پر دلیل ہے۔ یہ تاکید اس لیے فرمائی گئی ہے کہ یہ دونوں نمازیں نفس پر بہت شاق ہیں۔

'وَاَطْرَافَ النَّهَارِ' دن کے اطراف و اجزا میں تین نمازیں ہیں، چاشت، ظہر اور مغرب۔ چاشت اور مغرب کا اطراف نہار میں ہونا تو واضح ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ظہر بھی اطراف نہار میں ہے اس لیے

کہ دن دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ظہر کا وقت اس کے پہلے حصے کے آخری کنارے اور دوسرے حصے کے ابتدائی کنارے پر ہے۔

اس آیت سے ان لوگوں کے خیال کی نہایت واضح طور پر تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ نمازوں کے اوقات قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ قرآن میں صرف فرض نمازوں ہی کے نہیں بلکہ اشراق اور تہجد کے اوقات بھی مذکور ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی اوقات کو اپنے عمل سے منضبط کر کے ان کی حد بندی فرما دی۔ مختلف نمازوں کی شکلیں بھی معین فرما دیں اور یہ بھی بتا دیا کہ ان میں سے کن نمازوں کی حیثیت فرض و واجب کی ہے اور کن کی حیثیت نوافل کی۔ ظاہر ہے کہ ان تمام تفصیلات کا بتانا اور ہر نماز کے حدود و اطراف کا معین کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا کام تھا اس لیے کہ آپ صرف قرآن کے سنا دینے والے ہی نہیں بلکہ اس کے معلم بھی تھے۔

صبر و عزیمت کے حصول کے لیے نفل نمازوں کا اہتمام

یہاں اس امر کو بھی ملحوظ رکھیے کہ آیت زیر بحث میں نماز کی تاکید صبر و عزیمت کے حصول کی تدبیر کی حیثیت سے فرمائی گئی ہے۔ یہ آیات حق و باطل کی کشمکش کے نہایت مشکل دور میں نازل ہوئی ہیں۔ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے امت کو وہ تدبیر بتائی گئی ہے جو مشکلات و مصائب میں ثابت قدم رکھنے والی اور خدا کی رحمت و نصرت کا حق دار بنانے والی ہے۔ اس طرح کے حالات میں صرف فرض نمازوں ہی کا اہتمام مطلوب نہیں ہے بلکہ نوافل کا اہتمام بھی مطلوب ہے۔ قرآن، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور سلف صالحین کے عمل، ہر چیز سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ عام حالات میں تو تہجد و اشراق کی نمازوں کی حیثیت بہرحال نفلی نمازوں ہی کی ہے۔ لیکن مشکلات و مصائب میں، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، ان کا اہتمام ضروری ہے۔

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی!

اس مسئلہ پر ان شاء اللہ سورۂ مزمل کی تفسیر میں ہم وضاحت سے بحث کریں گے اور کسی موزوں مقام پر ان مصالح پر روشنی ڈالیں گے جو اوقات نماز کے تعین میں ملحوظ ہیں۔

نمازوں کے اندر سب کچھ ہے

'لَعَلَّکَ تَرْضٰی'، دوسرے مقام میں یہی مضمون یوں بیان ہوا ہے۔ 'وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی' (اور تمہارا رب عنقریب تمہیں عطا فرمائے گا کہ تم نہال ہو جاؤ گے) ان دو لفظوں کے اندر بشارتوں کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے موقف پر ڈٹے اور اپنے کام میں لگے رہو اور نمازوں کا اہتمام رکھو، خدا تمہیں دنیا اور آخرت دونوں میں وہ کامرانیاں بخشے گا کہ تم نہال ہو جاؤ گے! انہی نمازوں کے اندر تمہارے لیے سب کچھ محفوظ ہے۔ اپنے رب کے سوا تمہیں کسی اور طرف نگاہ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِہٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْھُمْ زَھْرَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا لِنَفْتِنَھُمْ فِیْہِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّکَ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی (۱۳۱)

امراء و اغنیاء سے بے نیازی کی ہدایت

اب یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کے امراء و اغنیاء کی زیادہ پروا اور دلداری کرنے سے روک دیا گیا۔ کسی قوم کے امراء و اغنیاء چونکہ قوم کے بناؤ اور بگاڑ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہی کے بگڑنے سے پوری

قوم بگڑتی اور ان کی اصلاح سے پوری قوم کے اصلاح پذیر ہونے کی توقع ہوتی ہے اس وجہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہمیشہ یہ سنت رہی ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اپنی اپنی قوموں کے سرداروں اور بڑوں کو مخاطب کیا اور جب تک انھوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے مایوس نہیں کر دیا اس وقت تک وہ ان کی اصلاح کی فکر میں لگے رہے۔ حضرات انبیاء کرام کی اس سنت کے مطابق ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سب سے پہلے قریش کے سادات و امراء کو دعوت دی کہ اگر وہ اس حق کو قبول کر لیں گے تو ان کے زور و اثر اور ان کے مال و اسباب ہر چیز سے دعوت حق اور غربائے مسلمین کو تقویت حاصل ہوگی۔ یہ خواہش سر تا سر ان امراء و اغنیاء کی خیر خواہی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے جذبہ پر مبنی تھی لیکن جب ان امراء و اغنیاء نے اپنے رویہ سے ثابت کر دیا کہ یہ پسیجنے والے نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو بھی ان کے لیے زیادہ فکر مند ہونے سے روک دیا اور فرمایا کہ تم ان کے مال و اسباب کو ذرا خاطر میں نہ لاؤ، تمھاری دعوت اپنا زاد و راحلہ خود اپنے ساتھ رکھتی ہے اور تمھارا اور تمھارے ساتھیوں کا کفیل اللہ ہے۔ اگر یہ لوگ اس حق کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں تو اس میں خود ان کی اپنی محرومی ہے، خدا ان کا اور ان کے مال و اسباب کا محتاج نہیں ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ۔ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ سے اشارہ قریش کے ان گروہوں کی طرف ہے جو مکّہ اور طائف وغیرہ میں عزت و اقتدار رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے مال و اسباب کی طرف آنحضرت صلعم کا نگاہ اٹھانا العیاذ باللہ اس لیے تو ہو نہیں سکتا کہ آپ کے اندر دولتِ دنیا کی کوئی طمع تھی۔ دولتِ دنیا تو مکّہ و طائف کے امراء بڑی سے بڑی مقدار میں حضورؐ کے قدموں پر نثار کرنے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ آپ اپنی دعوت سے باز آجائیں۔ لیکن آپ نے ان کی اس پیشکش کے جواب میں ان کو دعوتِ ایمان کی چند آیتیں سنا دیں۔ حضرات انبیائے کرامؑ اور صالحین نے ان لوگوں کے مال و اسباب کو کبھی وقعت نہیں دی ہے جنھوں نے اپنے دل اپنے رب کے حوالہ نہیں کیے ہیں۔ ایک عاقل و فرزانہ اگر ایک ایسے نوجوان کو دیکھتا ہے جو اپنی بھرپور جوانی اور اپنی تمام صلاحیتیں ایک بالکل غلط ہدف پر برباد کر رہا ہوتا ہے تو اس کے دل میں یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش یہ عاقبت نااندیش اور بے وقوف نوجوان اپنی جوانی اور صلاحیتوں کی قدر کرے، اسی طرح حضورؐ کے اندر بھی یہ ارمان تھا کہ کاش آپ کی قوم کے امراء و اغنیاء ان نعمتوں کی قدر پہچانیں جو اللہ نے ان کو بخشی ہیں اور ان کا مال اور ان کی صلاحیتیں شیطان کی راہ میں برباد نہ ہوں۔ اس ارمان و حسرت کا تعلق تمام تر جذبۂ خیر خواہی و ہمدردی سے ہوتا ہے۔ اس میں ہرگز طمع و حرص کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس جذبۂ خیر خواہی کی بھی ایک حد ہے۔ اس حد پر پہنچ جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اس چیز سے روک دیا۔

مَتَّعْنَا بِهِ: ایک امر واقعی کا اظہار ہے۔ دنیا میں اگر کسی کو مال و اسباب حاصل ہوتا ہے تو نہ وہ اس کے اب و جد کی میراث ہوتا اور نہ اس کی ذہانت و قابلیت کا ثمرہ بلکہ یہ خدا کی دین ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو دے کر یہ دیکھتا ہے کہ خدا کے دیے ہوئے مال و متاع کو پا کر یہ شخص خدا کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا ناشکرا۔ احمق ہے وہ

انسان جو اس حقیقت نفس الامری کو نہ سمجھے اور خدا کی نعمت کو خدا ہی کے خلاف بغاوت کا سبب بنا لے۔

'زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا' ہمارے نزدیک 'بِهٖ' کی ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ مجرور سے حال پڑنا فصیح عربی میں معروف ہے ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس کی مثالیں پیش کرتے آ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے جس مال و متاع سے ان کو بہرہ مند کیا ہے اس کی چمک دمک چند روزہ ہے۔ اس کا اگر کوئی نفع ہے تو یہ ہے کہ اس سے وہ آخرت کے لیے کچھ کمائی کر لیں۔ اگر وہ یہ نہیں کرتے تو یہ غازہ ایک دن اڑ جائے گا اور اس کی پیدا کردہ روسیاہی ہمیشہ کے لیے باقی رہ جائے گی۔

'لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ' یہ اس سنت الٰہی کا حوالہ ہے جس کی وضاحت اسی سورہ کی آیت 'وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا' کے تحت ہم کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں لوگوں کو مصائب سے بھی آزماتا ہے اور نعمتوں سے بھی۔ جب مصائب سے آزماتا ہے تو مقصود بندے کے صبر کا امتحان ہوتا ہے اور جب نعمتوں سے آزماتا ہے تو مقصود اس کے شکر کا امتحان ہوتا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے ان کو یہ مال و متاع جو بخشا ہے تو اس لیے نہیں کہ یہ اس کے حقدار تھے بلکہ اس لیے بخشا کہ ان کا امتحان کریں کہ یہ ہماری نعمتیں پا کر کیا بناتے ہیں۔ اگر انھوں نے ان نعمتوں کا یہی حق پہچانا ہے کہ ان کو پا کر بہاسے ہی آگے اڑیں تو اس کا انجام جلد دیکھ لیں گے!

'وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى' مطلب یہ کہ تم اپنی دعوت اور اپنے ساتھیوں کے لیے ان ناقدروں اور ناشکروں کی سرپرستی کے محتاج نہیں ہو۔ تمھارے اور تمھارے ساتھیوں کے لیے خدا کے پاس سے جو کچھ عطا ہونے والا ہے وہ ہزار درجہ بہتر بھی ہے اور پائدار بھی۔ ان مغروروں کے پاس جو کچھ ہے اس کی چمک دمک تو چند روزہ ہے لیکن خدا جو کچھ بخشے گا وہ ابدی ہے۔ اس کے لیے کبھی زوال نہیں ——— یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نیکی کا پودا اس آبِ حیات ہی سے پروان چڑھتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کی پرورش کے لیے نازل ہو۔ اگر آپ ہر جوہڑ کے پانی سے اس کو پروان چڑھانے کی کوشش کریں گے تو اوّل تو کسی ناپاک پانی سے اس کا نشوونما پانا ہی اس کی فطرت کے خلاف ہے اور اگر وہ بظاہر نشوونما پا بھی جائے گا تو وہ نیکی کے پھل نہیں بلکہ بدی ہی کے پھل دے گا۔ اس حقیقت کا تعلق حکمتِ قرآن سے ہے اور یہ تفصیل کے ساتھ اپنے محل میں زیر بحث آئے گی۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۭ لَا نَسْـَٔــلُكَ رِزْقًا ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (۱۳۲)

لفظ 'اہل' کا مفہوم

لفظ 'اهل' یہاں صرف اہل بیت نبیؐ کے مفہوم میں نہیں ہے۔ یہ لفظ عربی میں وسیع معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً اہل کتاب، اہل انجیل، اہل قریہ، اہل اللہ، اہل قرآن اور اہل حدیث، وغیرہ۔ لسان العرب میں ہے 'اهل الرجل اخص الناس به' (اہل الرجل سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس شخص سے خاص تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں) 'اهل كل نبي امته' (نبی کے اہل سے اس کے امتی مراد ہوتے ہیں) سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے حضرت عمرؓ کے خلیفہ بنانے کے بارے میں روایت ہے کہ جب قیامت کے دن میرا رب مجھ سے پوچھے گا کہ مسلمانوں کا والی کس کو بنا کے آئے ہو تو

عرض کردوں گا کہ 'استعملت علیھم خیر اھلک' (میں نے ان پر تیرے بہترین اہل کو خلیفہ بنایا ہے) سورۂ مریم کی آیت ۵۵ میں سیدنا اسماعیلؑ کے متعلق ارشاد ہوا ہے 'وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ' ظاہر ہے کہ یہاں بھی 'اھل' سے حضرت اسماعیلؑ کے بیوی بچے ہی مراد نہیں ہیں بلکہ وہ تمام لوگ مراد ہیں جو ان سے وابستہ تھے۔

اسی طرح آیت زیر بحث میں بھی 'اھل' سے وہ تمام لوگ مراد ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے، عام اس سے کہ وہ حضورؐ کے خاص متعلقین ہوں یا دوسرے مسلمان اور عام اس سے کہ وہ قریشی و ہاشمی ہوں یا لونڈی اور غلام۔ ان سب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ فی الحقیقت وہ سب لوگ نبی کے کنبہ کے افراد ہوتے ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور نبی کو اسی طرح ان کی خبرگیری کی فکر ہوتی ہے جس طرح کسی کو اپنے خاص کنبہ کی خبرگیری کی فکر ہوتی ہے۔ غور کیجیے کہ یہاں لفظ 'اھل' نے غربائے مسلمین کی کتنی عزت و شان بڑھائی ہے! جن بیچاروں کا ابھی تک کوئی پرسانِ حال نہیں تھا اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل میں شامل کر دیا!!

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔ ارشاد ہوا کہ تم اپنے لوگوں کو نماز کی ہدایت کرو اور اس پر جمے رہو۔ نماز سے مراد وہی نماز ہے جس کا اوپر والی آیت میں حکم دیا گیا ہے۔ یعنی اپنے اور اپنے لوگوں کے اندر صبر و استقامت پیدا کرنے کے لیے نماز کا اہتمام کرو اور استقلال کے ساتھ اس کا پورا پورا اہتمام کرو۔ 'اصْطَبِرْ عَلَيْهَا' کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ایک کسان اپنے کھیت میں ہل چلاتا، اس میں تخم ریزی کرتا، اس کو پانی دیتا اور برابر اس کی نگرانی کرتا ہے اسی طرح تم اپنے اس مبارک مزرعہ میں پوری محنت اور اس کی پوری حفاظت کرو، پھر دیکھو کہ اس سے دین و دنیا کی کیا برکتیں حاصل ہوتی ہیں! وہ برکتیں اس سے حاصل ہوں گی کہ نہال ہو جاؤ گے، تمھیں کسی اور کی طرف نگاہ اٹھانے کی احتیاج باقی نہیں رہے گی!!

'لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا' یعنی تمھارے اور تمھارے جاں نثاروں کے لیے روزی فراہم کرنے کی ذمہ داری ہم نے نہ تم پر ڈالی ہے اور نہ ہم تم سے اس کا مطالبہ کرتے ہیں، اس کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ 'نَحْنُ نَرْزُقُكَ' ہم تمھارے رزق کے ذمہ دار ہیں، تم ہمارا کام کرو اور نماز کا اہتمام رکھو۔ باقی جو ذمہ داری ہماری ہے وہ ہم پر چھوڑ دو۔ تم اس کے لیے فکرمند نہ ہو۔ سیدنا مسیحؑ نے اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے کہ "جو مزدور اپنی ڈیوٹی پر ہے وہ اپنی مزدوری کا حق دار ہے۔"

اسلامی نظام میں خلیفہ اور حکمران اسلامی کنبہ کا قیّم ہوتا ہے

یہاں 'نَرْزُقُكَ' میں ضمیر خطاب واحد پر بھی نظر رہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ہم تم کو اور تمھارے لوگوں کو روزی دیں گے، بلکہ فرمایا کہ ہم تم کو روزی دیں گے؛ آنحضرت صلعم سے یہ خطاب اسلامی کنبہ کے سربراہ اور قیّم کی حیثیت سے ہے۔ جب کنبہ کے قیّم سے یہ وعدہ کیا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے پورے کنبہ یعنی تمام مسلمانوں کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اسلامی نظام میں خلیفہ اور حکمران کی حیثیت پورے اسلامی کنبہ کے قیّم کی ہے اس وجہ سے اسے کنبہ کے ایک ایک فرد کی اسی طرح فکر رکھنی پڑتی ہے جس طرح ایک کنبہ کا سربراہ اپنے بیوی بچوں کی رکھتا ہے۔ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ

نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں اس حقیقت کو جس طرح ملحوظ رکھا اس کو بیان کروں تو بات دوسرے گوشوں میں نکل جائے گی۔ اس زمانے میں عوام کے غم میں اسٹیجوں پر نوحہ خوانی کرنے والے تو بہت مل جائیں گے لیکن کوئی نہیں جو حضرت عمرؓ کی طرح یہ ذمہ داری محسوس کرے کہ میری مملکت کے بعید ترین گوشوں میں بھی اگر کوئی بھوکا سوتا ہے تو اس کی مسئولیت مجھ پر ہے اور صرف محسوس ہی نہ کرے بلکہ عملاً اپنے احساس کو ثابت بھی کر دے، یہاں تک کہ یہ احساس اس کو خود اپنے بیوی بچوں تک سے غافل کر دے!!

وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی۔ اوپر والے ٹکڑے میں اس دنیا کے رزق و فضل کا وعدہ تھا۔ یہ آخرت کی کامیابی کی بشارت ہے یعنی انجام کار کی کامیابی تو بہرحال اہلِ تقویٰ ہی کے لیے ہے، اس میں تو کسی اور کا کوئی حصہ ہی نہیں۔

نماز رزق کی ضامن ہے

یہاں ظاہر پرستوں کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہوگی کہ نماز بھلا آدمی کے رزق کی ضامن کس طرح ہو سکتی ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ یہ حقیقت ان لوگوں کو نہیں سمجھائی جا سکتی جو نہ خود نماز کی روح سے آشنا ہیں اور نہ انھیں کسی حقیقی نماز آشنا سے آشنائی ہوئی۔ یہ چیز سمجھانے کی نہیں بلکہ جاننے اور سمجھنے کی ہے۔ صرف تجربہ ہی اس کا یقین پیدا کر سکتا ہے۔ جو نماز کے لذت آشنا ہیں وہی جانتے ہیں کہ اس میں کیا ہے۔ میری اس بات کو ادعا پر محمول نہ فرمائیے۔ میں خود ایک بے عمل آدمی ہوں لیکن میں نے خود اپنی آنکھوں سے تاریخ کے صفحات میں بھی اور چلتے پھرتے انسانوں میں بھی ایسی پیشانیاں دیکھی ہیں جن کے سجدوں کے نشانات کی تابناکی آفتاب کو بھی شرماتی تھی اور جن کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ تختِ جمشید کو بھی پائے استحقار سے ٹھکرا دینے والے تھے!!

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى (۱۳۳)

نشانی کا مطالبہ کرنے والوں کو جواب

مخالفین جب دلائل کے میدان میں ہر طرف سے پسپا ہو جاتے تو ان کا آخری حربہ یہ ہوتا کہ وہ مطالبہ کرتے کہ اگر یہ رسول ہیں تو اپنی رسالت کے ثبوت میں یہ اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں پیش کرتے؟ نشانی سے مراد کوئی حسی معجزہ بھی ہوتا اور اس طرح کا کوئی عذاب بھی جس سے قرآن ان کو رسول کی تکذیب کی صورت میں آگاہ کر رہا تھا۔ اس سوال کے اٹھانے میں بھی زیادہ دخل اہلِ کتاب کو تھا۔ وہ مشرکین کو اس دور میں جس طرح بہت سے سوالات القا کرتے تھے، جن کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں، اسی طرح یہ سبق بھی پڑھاتے تھے کہ ان مدعیِ رسالت سے مطالبہ کرو کہ جس طرح پچھلے رسولوں نے بہت سی نشانیاں دکھائیں یہاں تک کہ ان کی خبر کے مطابق ان کی قوموں پر عذاب بھی آئے، آخر یہ اس طرح کی کوئی نشانی کیوں نہیں دکھاتے۔ قرآن نے یہ اس مطالبہ کا جواب دیا اور اس جواب میں ان لوگوں کو بھی پیشِ نظر رکھا جو ان سوالات کے لیے وسوسہ اندازی کرتے تھے اور ان لوگوں کو بھی جو ان کو پیش کرتے تھے۔ اس آیت میں پہلے گروہ کو جواب دیا ہے اور اس کے بعد والی آیت میں دوسرے گروہ کو۔

پہلے گروہ یعنی اہلِ کتاب کو یہ جواب دیا کہ کیا ان کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ پچھلے صحیفوں میں جس آخری رسول کی بعثت کی بشارتیں تھیں ان کا مظہر اور مصداق ان کے سامنے آ گیا جس نے ان تمام پیشین گوئیوں کی تصدیق و تائید ان کے سامنے کر دی؟ ہم نے سورۂ بقرہ اور آلِ عمران کی تفسیر میں ان پیشین گوئیوں کا تفصیل سے حوالہ

دیا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ آنحضرت صلعم کو سابق صحیفوں کا جو مصدق کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی بعثت نے ان تمام پیشین گوئیوں کی عملی تصدیق کر دی۔ اسی تصدیق کو یہاں 'بینۃ' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى (۱۳۴)

اب یہ دوسرے گروہ یعنی مشرکین عرب کو پیش نظر رکھ کر جواب دیا کہ شامت زدہ لوگ دوسروں کے اتقاء سے متاثر ہو کر عذاب تو مانگتے ہیں لیکن اگر ہم رسول کے بھیجنے سے پہلے ان پر عذاب بھیج دیتے تو یہ قیامت کے روز یہ عذر کرتے کہ اے رب تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم اس ذلت و رسوائی سے دوچار ہونے سے پہلے تیری آیات کی پیروی کرتے۔ مطلب یہ کہ ہم نے اس عذر کو ختم کر دینے کے لیے ان کے پاس اپنا رسول بھیج دیا۔ اب ان پر حجت تمام ہو گئی۔ اگر اس کے بعد بھی یہ ایمان نہیں لاتے تو ان کے سامنے وہی چیز ظاہر ہو گی جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔

'ذلت' اور 'خزی' کا مفہوم

'ذلت' اور 'خزی' کے الفاظ اپنے عام استعمال میں ایک دوسرے کے مفہوم میں بھی آتے ہیں لیکن جب یہ دونوں ایک ساتھ آئیں جس طرح یہاں آئے ہیں تو ان کے درمیان ایک نازک سا فرق ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں 'ذلت' سے مراد وہ ذلت ہوتی ہے جس کا احساس ایک ذلیل ہونے والا خود اپنے باطن میں کرتا ہے اور 'خزی' سے وہ رسوائی مراد ہوتی ہے جو دوسروں کے سامنے اس کو ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ نہ ہم اپنی نگاہوں ہی میں ذلیل ہوتے اور نہ دوسروں کے آگے ہی رسوائی اور فضیحتا کی یہ نوبت آتی۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى (۱۳۵)

یہ آخری وارننگ ہے۔ اوپر کی دونوں آیتوں میں بات غائب کے صیغوں میں منہ پھیر کر فرمائی گئی ہے۔ اس میں شدتِ عتاب کے اظہار کے پہلو سے خطاب کے اسلوب میں فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اب فیصلہ کن مرحلہ سامنے ہے۔ دونوں پارٹیاں انتظار میں ہیں کہ اس کشمکش کا آخری انجام کیا ہوتا ہے اور اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے تو چندے انتظار کرو، عنقریب تم پر واضح ہو جائے گا کہ سیدھی اور ہموار راہ پر کون تھے اور وہ منزل مقصود پر پہنچنے والے بنے اور کون گمراہی کی راہ پر تھے اور وہ ہلاکت کے کھڈ میں گرے!

اس آیت میں میرے نزدیک قرینہ کی وضاحت کی بنا پر 'مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى' کا مقابل جملہ محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ میں نے اس محذوف کو کھول دیا ہے۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں سے درگزر فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔

لاہور

۲۵ر جنوری ۱۹۷۳ء